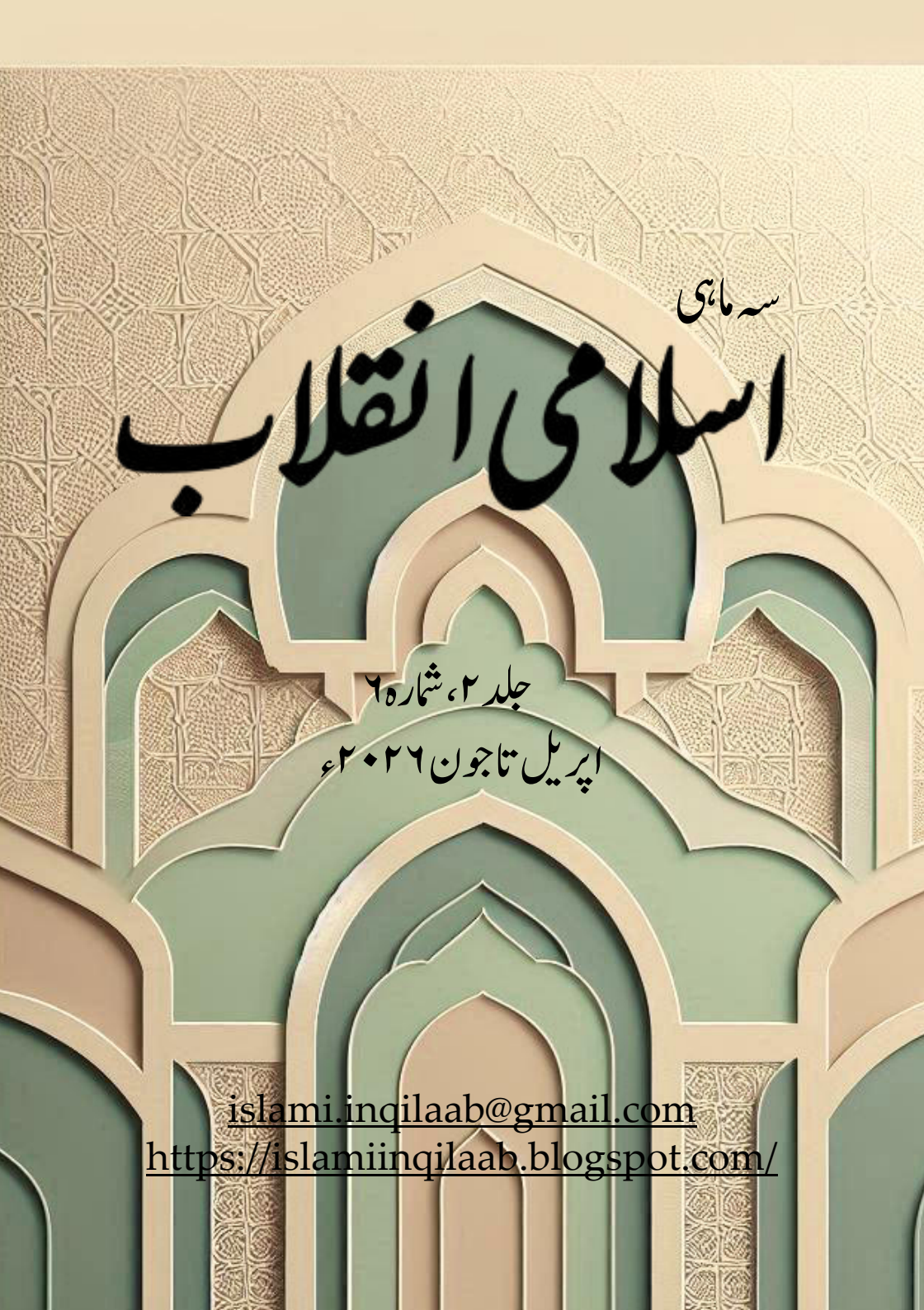

سہ ماہی

# اسلامی انقلاب

جلد ۲، شمارہ ۶

اپریل تا جون ۲۰۲۶ء

islami.inqilaab@gmail.com

https://islamiinqilaab.blogspot.com/

مدیر
علی محمد رضوی

سہ ماہی
# اسلامی انقلاب

نائب مدیر
سید ذیشان ارشد

مدیر منتظم: امین اشعر ☆ جلد ۲، شمارہ ۶۔ اپریل تا جون ۲۰۲۶ء

معاون مدیران: سید محمد یونس قادری، غلام جیلانی خان، کاشف شیخ، جاوید شیخ

مجلسِ تحریر: جاوید اکبر انصاری، سید یونس قادری، غلام جیلانی خان، سید ارشد، امین اشعر، علی محمد رضوی، کاشف شیخ، جاوید شیخ، مولانا حبیب الرحمٰن، سید رفیع الدین ہمدانی

## فہرست مضامین

### اردو سیکشن


| | | |
|---|---|---|
| سلام | مولانا احمد رضا خان | ۳ |
| غزل | امام سید علی حسینی شہید | ۵ |
| انقلابی اور اصلاحی تحرک میں ارتباط اور تضاد | اداریہ | ۷ |
| اسلامی ایران: مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا | جاوید اکبر انصاری | ۱۱ |
| ایران کا بحران | جاوید اکبر انصاری | ۱۴ |
| ٹرمپ غزہ امن منصوبہ اور اسلامی جماعتوں کی خموشی | جاوید اکبر انصاری | ۱۸ |
| بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی کی کامیابی | جاوید اکبر انصاری | ۲۰ |
| رسالہ اسلامی انقلاب: ایک سالہ سفر کا تنقیدی جائزہ | سید محمد یونس قادری | ۲۳ |
| کھلا خط | جاوید اکبر انصاری | ۲۹ |
| خط بنام محترم امیر جماعت مجلس وحدت المسلمین | جاوید اکبر انصاری | ۳۰ |
| قارئین کے خطوط | | ۳۱ |
| ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی رحلت پر خراجِ عقیدت | سید یونس قادری | ۳۳ |
| ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری | عارف الحق عارف | ۳۶ |
| عزیزان گرامی... حسین انصاری و محمد انصاری | علی محمد رضوی | ۴۳ |
| تصورِ آزادی کے تضادات | جاوید انصاری؛ علی رضوی | ۴۵ |

| | | |
|---|---|---|
| کانٹ کا فلسفہ اور ہیومنزم کی نظریاتی بنیادیں | علی محمد رضوی | ۵۵ |
| جرمنی میں لبرل ڈیموکریٹک نظم کی تحلیل | جاوید اکبر انصاری | ۹۱ |
| ربا اور بیع... اسلامی بینکاری کا تنقیدی جائزہ | سید محمد یونس قادری | ۹۸ |
| پاکستان میں امریکی اثر و رسوخ... انقلابی لائحہ عمل | سید محمد یونس قادری | ۱۲۵ |
| کیا جماعت اسلامی کی سیاست سے پہلو تہی کرنی چاہیے؟ | جاوید اکبر انصاری | ۱۳۱ |
| مجلہ جسارت برائے اجتماع عام نومبر ۲۰۲۶ء | جاوید اکبر انصاری | ۱۳۹ |
| جماعت اسلامی پاکستان کا اجتماع عام نومبر ۲۰۲۵ء | منصور اقمر | ۱۴۵ |
| اسرائیل کی سامراجی حکمت عملی | جاوید اکبر انصاری | ۱۶۹ |
| افغان معیشت کا استحکام فروغ پا رہا ہے | جاوید اکبر انصاری | ۱۸۰ |
| امارت اسلامیہ افغانستان کی معیشت جنوری ۲۰۲۶ء | یونس قادری | ۱۸۳ |
| تبصرہ کتب: رسالہ قشیریہ | غلام جیلانی خان | ۱۸۵ |


## English Section


| | | |
|---|---|---|
| Relationship and Tension between Revolutionary and Reformist Mobilisation | Editorial | 1 |
| Islamic Iran: Defiance of a Powerless Heart | J. A. Ansari | 6 |
| Trump's Gaza Peace Plan… | J. A. Ansari | 10 |
| JI's Success in Bangladesh: Expectations and Risks | J. A. Ansari | 14 |
| Pak-Afghan Conflict | J. A. Ansari | 19 |
| Israel's Imperial Strategy | J. A. Ansari & A. M. Rizvi | 25 |
| Shia-Sunni Unity is Indespensable | J. A. Ansari | 38 |
| Book Review | J. A. Ansari & Yunus Qadri | 43 |

# سلام بر سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مولانا امام احمد رضا خان قادری بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

مصطفی جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

مجھ سے بے کس کی دولت پہ لاکھوں دُرود
مجھ سے بے بس کی قوت پہ لاکھوں سلام

ہم غریبوں کے آقا پہ بے حد دُرود
ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام

فرحتِ جانِ مومن پہ بے حد دُرود
غیظِ قلبِ ضلالت پہ لاکھوں سلام

جس کے جلوے سے مرجھائی کلیاں کھلیں
اُس گلِ پاک مَنبت پہ لاکھوں سلام

جس کے آگے سرِ سروراں خم رہیں
اُس سرِ تاجِ رفعت پہ لاکھوں سلام

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام

جس طرف اٹھ گئی دم میں دم آ گیا
اُس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

نیچی آنکھوں کی شرم و حیا پر دُرود
اونچی بینی کی رفعت پہ لاکھوں سلام

جس سے تاریک دل جگمگانے لگے
اُس چمک والی رنگت پہ لاکھوں سلام

وہ دہن جس کی ہر بات وحیِ خدا
چشمۂ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام

اُس کی پیاری فصاحت پہ بے حد دُرود
اُس کی دل کش بلاغت پہ لاکھوں سلام

اُس کی باتوں کی لذّت پہ بے حد دُرود
اُس کے خطبے کی ہیبت پہ لاکھوں سلام

جس کی تسکیں سے روتے ہوئے ہنس پڑیں
اُس تبسم کی عادت پہ لاکھوں سلام

کُل جہاں مِلک اور جَو کی روٹی غذا
اُس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام

اُن کے ہر نام و نسبت پہ نامی دُرود
اُن کے ہر وقت و حالت پہ لاکھوں سلام

اُن کے مولا کی اُن پر کروڑوں دُرود
اُن کے اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام

پار ہائے صُحف غنچہ ہائے قُدُس
اہلِ بیتِ نبوت پہ لاکھوں سلام

اُس بتولِ جگر پارۂ مصطفی
حجلہ آرائے عِفّت پہ لاکھوں سلام

جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے　　اُس رِدائے نَزاہت پہ لاکھوں سلام
سیّدہ زاہرہ طیّبہ طاہرہ　　جانِ احمد کی راحت پہ لاکھوں سلام
حَسَنِ مجتبیٰ سیّدُ الاسخیا　　راکبِ دوشِ عزت پہ لاکھوں سلام
شہد خوارِ لُعابِ زبانِ نبی　　چاشنی گیرِ عصمت پہ لاکھوں سلام
اُس شہیدِ بَلا شاہِ گلگوں قبا　　بے کسِ دشتِ غربت پہ لاکھوں سلام
اہلِ اسلام کی مادرانِ شفیق　　بانوانِ طہارت پہ لاکھوں سلام
سَیِّما پہلی ماں کہفِ امن و اماں　　حق گزارِ رفاقت پہ لاکھوں سلام
عرش سے جس پہ تسلیم نازل ہوئی　　اُس سرائے سلامت پہ لاکھوں سلام
بنتِ صدّیق آرامِ جانِ نبی　　اُس حریمِ براءت پہ لاکھوں سلام
یعنی ہے سورۂ نور جن کی گواہ　　اُن کی پُر نور صورت پہ لاکھوں سلام
جاں نثارانِ بدر و اُحُد پر دُرود　　حق گزارانِ بیعَت پہ لاکھوں سلام
وہ دسوں جن کو جنت کا مژدہ ملا　　اُس مبارک جماعت پہ لاکھوں سلام
مومنیں پیشِ فتح و پسِ فتح سب　　اہلِ خیر و عدالت پہ لاکھوں سلام
جس مسلماں نے دیکھا اُنھیں اک نظر　　اُس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام
جن کے دشمن پہ لعنت ہے اللہ کی　　اُن سب اہلِ محبت پہ لاکھوں سلام
اور جتنے ہیں شہزادے اُس شاہ کے　　اُن سب اہلِ مکانت پہ لاکھوں سلام
تیرے ان دوستوں کے طفیل اے خدا　　بندۂ ننگِ خلقت پہ لاکھوں سلام
میرے اُستاد ماں باپ بھائی بہن　　اہلِ وُلد و عشیرت پہ لاکھوں سلام
ایک میرا ہی رحمت میں دعویٰ نہیں　　شاہ کی ساری اُمّت پہ لاکھوں سلام
کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور　　بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام
مجھ سے خدمت کے قُدسی کہیں ہاں! رضاؔ　　مصطفی جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

# غزل

امام سید علی حسینی شہید (سیدِ خراسانی)

دِلا! ز معرکه‌ی محنت و بلا مگریز
چو گِرد باد به هم پیچ و چون صبا مگریز
تو را است معجزه در کف، ز ساحران مهراس
عصا بیفکن و از بیم اژدها مگریز
تو موج غیرت و عزمی، ز بحر بیم مدار
حذر ز غرش طوفان مکن ز جا مگریز
ز سست عهدی ایام دلشکسته مشو
نشانه باش چو پرچم، ز بادها مگریز
چو صخره باش و مکن تکیه جز به دامن کوه
به حق سپار دل خویش و از دعا مگریز
تو از تبار دلیران خیبر و بدری
چو ذوالفقار و چو حیدر بزن صلا مگریز
به نوشخند منافق ز ره کناره مگیر
به زهرخند معاند به انزوا مگریز
چو ره به قبله‌ی امن است پایمردی کن
خطا مکن، ز توهم به ناکجا مگریز
چو تیر راه هدف گیر و بر هدف بنشین
ز کجروی به حذر باش و از خدا مگریز
«امین» خلق و امانت گزار یزدان باش
به صدق کوش و خطر کن ز مدعا مگریز

ترجمہ

اے دل! مصیبتوں اور آزمائشوں کے میدان سے فرار اختیار نہ کر،
گرد باد کی طرح ہمت سمیٹ کر خود میں تلاطم تو پیدا کر، مگر صبا کی طرح راہِ فرار اختیار نہ کر۔
تیرے ہاتھ میں معجزہ ہے، جادوگروں سے نہ ڈر،

اپنا عصا پھینک اور اژدہے کے خوف سے پیچھے نہ ہٹ۔
تو غیرت اور عزم کی موج ہے، سمندر کی وسعت سے نہ ڈر
طوفان کی گرج سے نہ ڈر، اپنی جگہ سے نہ ہٹ۔
زمانے کی بے وفائی سے دل شکستہ نہ ہو،
پرچم کی مانند استقامت کا نشان بن جا، ہواؤں سے نہ گھبرا۔
چٹان بن جا اور خدا کے دامن کے سوا کسی پر تکیہ نہ کر؛
اپنا دل حق کے سپرد کر دے اور دعا سے منہ نہ موڑ۔
تو خیبر اور بدر کے دلیروں کی نسل سے ہے،
ذوالفقار اور حیدر کی طرح للکار، پیچھے نہ ہٹ۔
منافق کی جھوٹی مسکراہٹ تجھے راستے سے نہ بھٹکائے
اور دشمن کا زہریلا طنز تجھے گوشہ نشینی پر مجبور نہ کرے۔
جب راستہ قبلۂ امن (حق) کی طرف جا رہا ہو تو ثابت قدم رہ؛
وہم و گمان کے پیچھے لگ کر بے مقصد راستوں کی طرف نہ بھاگ۔
تیر کی طرح سیدھا ہدف کی طرف بڑھ اور نشانے پر جا بیٹھ،
کج روی سے بچ، اور خدا سے منہ نہ موڑ۔
خلقِ خدا کا "امین" اور رب کا امانت دار بن،
سچائی کے لیے تگ و دو کر، خطرات کا سامنا کر، اپنے مقصد سے پیٹھ نہ پھیر۔

# اداریہ: انقلابی اور اصلاحی تحرک میں ارتباط اور تضاد

## نظام کیا ہے؟

انقلابی اور اصلاحی تحرک ہمیشہ ایک مخصوص نظاماتی تناظر میں رونما ہوتا ہے۔ نظام وہ اکائی ہے جو ایک مخصوص تصورِ حق کو بروئے کار لانے کے لیے اپنے دائرۂ کار میں انسانی تعلقات کو یوں مرتب کرتی ہے کہ ایک مخصوص انفرادیت، معاشرت اور ریاست کا غلبہ قائم ہو۔ مثلاً سرمایہ داری کو ایک نظام اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا ایک مخصوص تصورِ حق ہے۔ یہ فروغ آزادی (یعنی نفس امارہ کی غلامی) ہے۔ سرمایہ داری ایسی انفرادیت، معاشرت اور ریاست کے تغلب کی جستجو کرتی ہے جو حصول آزادی (یعنی نفس امارہ کی غلامی) کی جستجو کی تقدیم کو قائم کریں۔

جیسا کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اسلام بھی ایک نظام ہے[۱]۔ اس کا ایک مخصوص تصورِ حق ہے۔ یہ عبادت یعنی بندگی ہے۔ اسلام، انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو یوں ترتیب دیتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں جستجوئے عبادت غالب ہو۔ چونکہ عبادت آزادی کی ضد ہے لہٰذا اسلامی نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کو منتشر کیے بغیر اور اسے تسخیر کیے بغیر سرے سے قائم ہی نہیں کیا جا سکتا۔

## انقلاب، اصلاح اور نظاماتی تغیر

انقلابی جدوجہد دو قسم کی ہوتی ہے۔ کچھ انقلابات ایک مخصوص نظام کے کچھ تضادات کو رفع کرنے کے لیے برپا کیے جاتے ہیں۔ مثلاً برطانوی انقلاب، فرانسیسی انقلاب، روسی انقلاب، یہ سب سرمایہ دارانہ انقلاب تھے۔ یہ انقلابات سرمایہ دارانہ نظام کے کچھ نظاماتی تضادات کو رفع کرنے کے لیے برپا کیے گئے تھے۔ اس کے برعکس اسلامی انقلابی سرمایہ دارانہ تضادات کو مہمیز دینا چاہتے ہیں۔ اسلامی انقلاب کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح نہیں بلکہ اس کے

انہدام کی کوشش کرنا ہے۔

اسی طرح اصلاحی عمل بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو حاضر اور موجود نظام سے سمجھوتہ کرے اور اس کی کارفرمائی کو اپنے بیانیے سے جواز فراہم کرتے ہوئے جزوی اصلاح کے ذریعے کچھ نظاماتی تضادات رفع کرنا چاہتا ہو۔ مثلاً اسلامی دستوریت، اسلامی بینکاری، بنو قابل، عورتوں کی پبلک لائف میں شمولیت، اے آئی کے تہذیبی غلبے سے مصالحت اور اسلام کو محض ایک تصور حیات کے طور پر بیان کرنے کی مہمات وغیرہ۔ یہ تمام اصلاحی کوششیں سرمایہ دارانہ نظام کے تضادات رفع کرنے کی کوششیں ہیں۔ دوسری قسم کی اصلاحی کوششیں وہ ہیں جو انقلابی جدوجہد سے منسلک ہوں۔

لیکن پاکستان میں بیشتر اصلاحی مہمات اور مغرب میں صوفیائے عظام کی تحریکیں سرمایہ دارانہ نظام کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی معاشرت کے اندر فروغ عبدیت اور تحدید آزادی کی گنجائش تلاش کرتی ہیں۔ ان اصلاحی تحریکوں کا محور اور مرکز آزادی نہیں ہے بلکہ عبدیت کا فروغ ہے۔ ان کی پاکستان میں نمائندہ عوامی تحریکیں تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی ہیں۔ مخلصین دین کا ایک بڑا حصہ اصلاحی تحریکوں سے وابستہ اور متاثر ہے اور انفرادیت اور معاشرتی سطح پر جو کچھ اسلامیت کا اظہار ہے انہی اصلاحی تحریکات کے دم سے قائم ہے۔

## اسلامی انقلابی دور

ہم اسلامی انقلابی ہیں۔ ہم سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح نہیں چاہتے۔ اس کا انہدام چاہتے ہیں۔ انہی معنوں میں ہم جو انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں وہ سرمایہ دارانہ انقلاب نہیں ہے۔ ہم محض سرمایہ دارانہ نظمِ اجتماعی میں ترتیب کی تبدیلی کی جستجو نہیں کر رہے۔ ہماری رائے میں سرمایہ دارانہ نظاماتی تغلب کے تناظر میں ایک اسلامی حکومت کا قیام ایک فعل عبث ہے۔ یہ انقلابی جماعت پر سرمایہ دارانہ ریاست کے قبضے کے مترادف ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظاماتی تسخیر کو ناممکن بنانے کا ایک طریقہ ہے۔

اسی طرح ہم اس تمام اصلاحی کام کے مخالفت کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ تضادات کو رفع کر

کے فروغ آزادی کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ یعنی وہ تمام دہریہ لادینی اصلاحی مہمات جو دعوت سے مبرا اور سرمایہ دارانہ حقوق (human rights) اور تحکمِ قانونِ سرمایہ (the rule of the law of capital) کے فروغ کے لیے چلائی جارہی ہیں ہم ان کو سرمایہ داری کے فروغ کے مختلف طریقے سمجھتے ہیں۔

اس کے برعکس ہم ان تمام اصلاحی کوششوں کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی پشت پناہی کے خواہاں ہیں جو اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے متحرک ہیں اور دعوت سے منسلک ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ ان دعوتی اصلاحی تحریکوں سے رابطہ کرنے میں ہم نے کوتاہی کی ہے۔

خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف

جب تک دعوتی عملِ اصلاح کے علمبردار اسلامی انقلابی جدوجہد کی پشت پناہی پر آمادہ نہ ہوں گے اسلامی انقلابی جدوجہد مخلصین دین کے سواد اعظم کے لیے اجنبی رہے گی۔

اے بھائی اگر تم ساتھ نہ دو تو ہم سے اکیلے کیا ہو گا

## نوٹس و حوالہ جات

۱۔شاہ صاحب کی فکر کے مندرجہ ذیل پہلو یہاں قابل ذکر ہیں:

۱۔ نظام کی ہمہ گیریت (Systemic Totality)

شاہ صاحب کے نزدیک دین محض چند رسومات کا نام نہیں، بلکہ ایک مکمل "نظامِ حیات" ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسانی معاشرہ جب فساد کا شکار ہوتا ہے تو محض انفرادی اصلاح کافی نہیں ہوتی، بلکہ "فکّ کل نظام" (پورے نظام کو توڑ دینا) ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ایک نیا عادلانہ نظام قائم ہو۔

۲۔ بندگی بمقابلہ آزادی (نفسِ امارہ کی غلامی)

شاہ ولی اللہ کے مطابق، اسلام کا مقصودِ اصلی "اعلاءِ کلمۃ اللہ" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے تمام شعبے (معیشت، سیاست، معاشرت) اللہ کی بندگی کے تابع ہو جائیں۔ وہ

اسے "فطرت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ تمام نظام جو انسانی خواہشات یا جبری حاکمیت پر مبنی ہوں، وہ ان کے نزدیک "جاہلیت" یا "فساد" ہیں۔

۳۔ نظامِ تمدن اور معیشت

شاہ صاحب نے معاشی فساد کو روحانی فساد سے جوڑا ہے اور اسے نظام کے بگاڑ کی بڑی وجہ قرار دیا ہے۔ ان کے مشہور ارشادات میں سے ایک کا مفہوم یہ ہے:

"جب ریاست میں معاشی توازن بگڑ جائے اور لوگ محض عیش و عشرت یا بقائے دوام کی تگ و دو میں لگ جائیں، تو وہ بندگیِ رب سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ایسا نظام "سرطان" کی طرح ہے جسے جڑ سے کاٹنا ضروری ہے۔"

۴. تسخیر اور تغلب (Conquest and Dominance)

شاہ صاحب کے نزدیک ایک صالح نظام کا غلبہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ باطل نظام کو مغلوب نہ کر دے۔ ان کی فکر میں "جہاد" اور "انقلاب" کا تصور یہی ہے کہ حق کا غلبہ باطل کے مکمل استیصال (Eradication) کے بغیر ناممکن ہے۔

# اسلامی ایران: مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

جاوید اکبر انصاری

آج ایران پر اسرائیلی۔امریکی دہشت گردوں کی مسلط کردہ جنگ کا بارہواں دن ہے اور ابھی جنگ کے متوقع نتائج کے بارے میں کوئی حتمی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ تاہم اب تک جو نتائج سامنے آئے ہیں، ان کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ دہشت گردی ایران پر کیوں مسلط کی گئی ہے؟ اس کا بنیادی سبب ایران میں اسلامی ریاست کا قیام اور اس کا استحکام ہے، جسے سامراج کسی صورت برداشت کرنے پر تیار نہیں۔ یہ اسلامی ریاست اسرائیل کی علاقائی توسیع کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی لیے سامراج نے پہلے ہی دن سے اس کے خاتمے کے ہدف کا اعلان کر دیا تھا اور وہ اس مقصد کے لیے گزشتہ ۴۶ سال سے مسلسل تیاری کرتا آرہا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی کوئی اسلامی ریاست وجود میں آئے گی، سامراج جلد یا بدیر اس پر حملہ آور ہو گا۔ اس کے برعکس غیر اسلامی مسلم ریاستوں (پاکستان، ترکی، مصر) کو وہ اپنا باج گزار بنا سکتا ہے اور انہیں سامراجی سرمایہ دارانہ نظم میں ضم بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسلامی ریاستوں کا وجود اور ان کا استحکام سامراج کے لیے سب سے بڑا، دیرپا اور بنیادی خطرہ ہے۔

یہ کھٹکتی ہے دلِ کافر میں کانٹے کی طرح

اسلامی اصلاحی اور دعوتی رویے کو سامراج برداشت کر سکتا ہے اور مصلحین سے سمجھوتے کی تو سامراج کی ایک طویل تاریخ ہے لیکن جب مصلحین کے ہاتھوں میں ریاست کی قوت آتی ہے تو یہ سمجھوتے قائم نہیں رکھے جاسکتے۔

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحر قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

کلیم اللہ کا عصا ہی وہ ذریعہ ہے جس کے استعمال سے سامراج کو مسمار کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے امام خمینی رحمہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں وصیت کرتا ہوں کہ جلد از جلد انقلاب کو برپا کرو۔ افسوس اس بات کا ہے کہ امت کا سواد اعظم اس وصیت کو قبول نہیں کرتا اور اصلاحی اور انقلابی جدوجہد کو ایک قالب میں ڈھالنے کی کوششوں کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔

یہ دور حاضر میں ریاستی جدوجہد کی اقامت دین کی جدوجہد میں تقدیم کی ناقابل فراموش دلیل ہے۔

دوسرا سبق جو ہمیں ایرانی جدوجہد سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی انقلاب انقلابی علماء ہی برپا کر سکتے ہیں۔

وہ علماء جن میں یہ صلاحیت ہو کہ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

کیونکہ

خلافت بالیقیں انہی کو ملنی چاہیے پہلے
امیر المومنین ان میں سے چن کر لائے پہلے

گزشتہ ۴۶ سال میں ایران کے علماء نے اپنی تنظیمی اور تکنیکی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ انہوں نے ملکی امن و امان کے قیام کے لیے عسکری صلاحیتوں کو غیر معمولی اہمیت دی۔ اسی وجہ سے امریکی، اسرائیلی اور خلیجی بری افواج کے لیے ایران میں داخل ہونا تقریباً ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ انہوں نے نگرانی (سرویلنس) کا ایک مستحکم نظام قائم کیا ہے اور بیشتر صہیونی حملے ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ ان کا میزائل پروگرام بھی نہایت مؤثر ثابت ہوا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنگ کے باوجود ملک میں ترسیلِ اجناس اور خوراک کا نظم درہم برہم کرنے کی کوششیں مکمل طور پر ناکام رہی ہیں۔

پھر علماء کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہایت نامساعد حالات کے باوجود عوام کو اپنے ساتھ وابستہ رکھا ہے۔ سامراج کو یہ توقع تھی کہ اس کے حملوں کے جواب میں عوام

بغاوت کر دیں گے، لیکن یہ امید بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ یہاں تک کہ اب جمہوریت نواز حلقے بھی اسلامی حکومت کے خاتمے کا مطالبہ نہیں کرتے اور تقریباً ہر روز بڑے شہروں میں عوام حکومت کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لاطینی امریکی ممالک جیسے وینزویلا اور میکسیکو کے برخلاف ایران نے امریکی و اسرائیلی مطالبات کے سامنے سر جھکانے کے بجائے سر بلند رکھتے ہوئے اپنے جوہری پروگرام کو محفوظ رکھا ہے۔

اشتراکی اور اسلامی انقلاب میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اشتراکی انقلاب عوام کی خواہشات کو بڑھاتے ہیں، جبکہ اسلامی انقلاب عوام کو قربانی دینے پر آمادہ کرتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ایران یہ جنگ جیت کر مستحکم اسلامی ریاست کی شکل میں ابھرے گا۔ لیکن اگر مجاہدین یہ جنگ ہار بھی جائیں تو یہ ایک وقتی پسپائی ہو گی اور جب تک سامراج مکمل طور پر شکست نہ کھا جائے ہم یہ جنگ مصر میں، ترکی میں، یمن میں، نائیجیریا میں اور ہر جگہ لڑتے رہیں گے۔

# ادارتی مضامین

# ایران کا بحران

جاوید اکبر انصاری

ایران کی داخلی معاشی پالیسیوں کے بارے میں ہمیں بہت کم معلوم ہے لہٰذا ہم اس ضمن میں تجزیہ مرتب کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایران میں ایک معاشی بحران آیا ہوا ہے۔ تورم (inflation) آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ تومان کی بین الاقوامی قیمت تیزی سے گر رہی ہے۔ اسلامی حکومت معاشی استحکام پیدا کرنے میں ناکام نظر آتی ہے۔

یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ معاشرتی اور معاشی پالیسی سازی نے عوام میں جذبۂ قناعت اور ایثار کو فروغ دینے میں کوتاہی کی جس کے نتیجہ میں عوام میں بے چینی اور انتشار پھیلا اور مخالفین کو یہ موقع ملا کہ وہ عوام کو اسلامی حکومت کے خلاف متحرک کر سکیں۔

اسلامی انقلابیوں نے ایران میں جمہوری نظاماتی ڈھانچے کو اسلامی اقدار میں سمونے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف لبرل اور قوم پرست عناصر کو منظم ہونے کا موقع ملا بلکہ خود علماء کی صفوں میں جمہوریت اور انفرادیت پسندی پروان چڑھی جس کا اظہار صدر کے انتخابات میں "معتدل" افراد کی بار بار کامیابی سے ہوتا ہے۔ جمہوری ڈھانچے کو اگر ترک نہ کیا گیا تو اسلامی اقتدار ہمیشہ خطرے میں رہے گا اور عوامی رائے رضائے الٰہی کے تابع نہ رہے گی۔

ایران میں جاری جمہوری عمل نے سامراجی مداخلت کی راہ ہموار کی۔ آج جو بحران آیا ہے، اس کی پشت پر سامراج بالخصوص امریکا اور اسرائیل ہیں جو اسلامی حکومت سے خائف ہیں اور شاہی نظام کو واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلوائیوں کو اکسایا جا رہا ہے کہ وہ بڑے شہروں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اسلامی نظام کی شکست اور اسلامی حکومت کا خاتمہ اسرائیل اور امریکا کا کلیدی ہدف ہے۔

بلوائیوں کا اہم ترین نعرہ "مرگ بر خامنہ ای" ہے یعنی وہ رہبر انقلاب حضرت امام خامنہ ای کی قوت کی پسپائی کو اپنی شورش کی کامیابی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ امریکہ اور اسرائیل اس نوعیت کے اقدام کریں جو امریکا نے وینزویلا کے صدر کو اغوا کرنے کے لیے کیے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ امریکا اور اسرائیل اس قسم کی کارروائی کریں گے یا نہیں یا انہیں اس میں کامیابی ملے گی یا نہیں۔ امکان یہی ہے کہ اس قسم کی مہم ناکام ہو جائے گی جیسے ۱۹۸۰ء میں امریکا کی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ لیکن ہمیں امام کی شہادت کی صورت میں متبادل قیادت کی فراہمی کی تیاری یقیناً کرنی چاہیے۔

ابھی تک حکومت مخالف مظاہرے چند شہروں اور ان کے نواح تک محدود ہیں اور ان کی کوئی مرکزی قیادت سامنے نہیں آئی ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ بسیج اور انقلاب کے محافظین (Revolutionary Guards) اپنی سرفروشانہ کارروائیوں سے صورت حال پر قابو پالیں گے لیکن ایسا لگتا ہے کہ عوام میں سے اسلامی حکومت کے حمایتی ابھی تک متحرک نہیں ہوئے ہیں۔ جو رپورٹیں آ رہی ہیں اور وہ تقریباً سب کی سب سامراجی میڈیا کی اشاعت کی ہوئی ہیں۔ اسلامی حکومت کو اپنے حمایتی عوام کو بلوائیوں کے خلاف منظم اور متحرک کرنے کی خاص کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں ردِ انقلاب تحریک کے خلاف ایک تازہ تجدیدِ انقلاب اسلامی تحریک چلانی چاہیے، جس کو محض ریاستی کارروائی (بسیج اور انقلابی محافظین) کے ذریعے فروغ نہیں دیا جا سکتا۔

[بعد ازاں جیسا کہ معلوم ہوا اسلامی انقلاب کے دفاع کے لیے ملک کے طول و عرض میں عظیم الشان مظاہرے نکالے گئے جس میں لاکھوں لوگ شریک ہوئے۔ شہداء کے جنازوں میں شرکت کے ذریعے بھی اسلامی عوامی طاقتیں متحرک ہو رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مظاہروں کے ذریعے متحرک ہونے والے عوام کو محلے اور مساجد کی سطح پہ اسلامی انقلاب اور حکومت کے دفاع کے لیے منظم کیا جائے]

ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ مخصوص پالیسیوں کا تجزیہ کر سکیں اور ان کو تباہیوں کی نشان دہی

کر سکیں جن کے سبب موجودہ بحرانی حالات رونما ہوئے ہیں لیکن تجدید و تقویت انقلاب اسلامی کے لیے حکمت عملی کے ضمن میں چند اصولی گزارشات پیش خدمت ہیں۔

۱۔ جمہوری عمل کی تحدید کی ضرورت ہے۔ معاشرے پر ریاستی گرفت مضبوط کی جائے اور ان عوامل کی نشان دہی کی جائے جن سے معاشرے میں حرص و حسد فروغ پا رہا ہے۔ عوام میں توکل، قناعت اور ایثار کے جذبات کو فروغ دینے کی مہمات چلائی جائیں۔

۲۔ نیوکلیئر پروگرام کو تیز رفتاری سے آگے بڑھایا جائے۔ نیوکلیئر ہتھیاروں کا حصول اور تیاری جلد ممکن بنانے کی کوشش کی جائے کیونکہ یہ اسلامی نظام کے دفاع کا موثر ترین ذریعہ بن سکتے ہیں۔

۳۔ بسیج اور انقلابی محافظین (Revolutionary Guards) کی صفوں میں ہنگامی طور پر اضافہ کیا جائے اور ان اداروں کو بلدیاتی انتظامی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔

۴۔ پاکستان، چین اور روس سے معاہدے کیے جائیں۔

۵۔ بلوائیوں کی اسلام دشمنی ثابت کی جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہیومن رائٹس کے نظریے کو ناقابل اعتبار delegitimize ثابت کیا جائے اور اسے کفریہ سرمایہ دارانہ معاشرے کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ ثابت کیا جائے۔

۶۔ ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ علاقے کے مسلم ممالک کو امریکی فوجی اڈوں کے ذریعے ایران پر حملہ آور ہونے سے باز رکھا جائے۔ یہ بنیادی طور پر ان ممالک کی اسلامی جماعتوں اور گروہوں کی ذمہ داری ہے۔ ان کو احساس ہونا چاہیے کہ ایران اسلام کا مضبوط ترین قلعہ ہے اور اس کا تحفظ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ پاکستان میں بالخصوص اسلامی جماعتوں کو متحد ہو کر ایران کی حمایت میں بڑے مظاہرے منعقد کرنے چاہئیں۔ پاکستان کی شیعہ برادری کو ایرانی اسلامی حکومت کی حمایت میں متحرک کرنے کی ضرورت ہے اور عراقی شیعہ حلقوں کو بھی موبلائز کیا جا سکتا ہے۔ شاید اس کا امکان کویت اور بحرین میں بھی ہو۔ ایران پر حملہ سامراج کا اسلام پر حملہ ہے جس کا ہم سب کو مقابلہ کرنا چاہیے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ زر مبادلہ کی گراوٹ کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس گراوٹ کی روک تھام کے لیے دیکھا جائے کہ کیا یہ بحران مصنوعی ہے جسے سامراج نے پیدا کیا ہے یا نہیں۔ اصولاً اس بحران پر قابو پانے کے لیے بیرونی ترسیل زر پر ریاستی پابندیوں میں اضافے اور خود کفالتی معیشت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ایران، امارت اسلامیہ افغانستان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے جہاں نامساعد حالات اور کڑی پابندیوں کے باوجود اسلامی حکومت افغانی کی بین الاقوامی قیمت کو مستحکم رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے۔

آخر میں تمام مسلمان بھائیوں اور بہنوں سے التماس ہے کہ وہ ایرانی اسلامی حکومت کے تحفظ کے لیے ہر نماز میں دعا کریں۔ انقلاب اسلامی کے بعد یہ تیسری مرتبہ ہوا ہے کہ دہریوں نے اسلامی نظام پر بڑا بہیمانہ حملہ کیا ہے۔ ان شاء اللہ پہلے دو حملوں کی طرح یہ حملہ بھی ناکام ہو گا۔ ہم دعا گو ہیں کہ اسلامی حکومت ان وجوہات کو رفع کر سکے جن کی بنیاد پر بلوائی دہریوں کو عوامی سطح پر قدم جمانے کا موقع ملا ہے۔ بنیادی ضرورت جمہوری نظام کی بیخ کنی کی ہے۔

# ٹرمپ کا غزہ امن منصوبہ اور اسلامی جماعتوں کی خاموشی

جاوید اکبر انصاری

ٹرمپ کے امن منصوبے کا اصل مقصد اسرائیل کی عسکری شکست کو سامراج کی فتح میں تبدیل کرنا ہے۔ اپنی فوجی برتری اور امریکا کی بھرپور اعانت کے باوجود ۲۰۲۳ء سے جاری جنگ میں اسرائیل نہ اپنے جاسوسوں کو رہا کرا سکا نہ پورے غزہ کو اپنے زیر تسلط لا سکا۔ آج بھی غزہ کا پچاسی فیصد سے زیادہ علاقہ حماس اور دیگر اسلامی جہادی تنظیموں کے ماتحت ہے۔

چونکہ نہ اسرائیل نہ امریکا یہ قوت رکھتا ہے کہ حماس کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکے، لہٰذا انہوں نے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے مذاکرات کا ڈھونگ رچایا ہے۔ اگر یہ امن منصوبہ کامیابی سے نافذ ہو گیا تو نہ صرف حماس ہتھیار ڈال دے گی بلکہ پورے غزہ پر اسرائیلی تحکم مستحکم ہو جائے گا اور سامراج پورے طریقہ سے غزہ کی معاشرت اور معیشت پر اپنا تسلط قائم کر لے گا۔

اس منصوبہ کے اعلامیے کے باوجود اسرائیل کی غزہ پر فوج کشی جاری ہے اور جنوری ۲۰۲۶ء تک مسلمان شہداء کی تعداد بقول اسرائیلی فوج چوہتر ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس امن معاہدے کے بارے میں یہ کہنا درست لگتا ہے

وہی قتل بھی کریں ہیں، وہی لیں ثواب الٹا

امن معاہدے کا مقصد غزہ سے اسرائیل کے خلاف مزاحمت کو ختم کر دینا ہے۔ امن قائم کرنے کی یہ بنیادی شرط ہے۔ اگر کسی شکل میں بھی، خواہ عسکری، خواہ جمہوری، خواہ مزاحمتی، اسرائیل کے فیصلے کو چیلنج کیا گیا تو اسرائیل دہشت گرد کارروائیوں کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ غزہ کی تعمیراتی بحالی اور ترقی کے لیے جو اسکیمیں متصور کی گئی ہیں وہ سب غزہ پر سامراجی تسلط کی اسکیمیں ہیں۔ بنیادی ترقیاتی تصور یہ ہے کہ غزہ کے علاقے کو امریکی، یورپی اور اسرائیل عیاشیوں کے لیے ایک عشرت کدے میں تبدیل کر دیا جائے جہاں فحاشی اور عریانی فروغ پائے اور غزہ کی اپنی روایتی اسلامی معاشرت کی دھجیاں بکھیر دی جائیں۔

مسلم دنیا کے کئی سامراج نواز ممالک اس شرم ناک منصوبے کے شریک کار ہیں جن میں پاکستان، مصر، ترکی، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور انڈونیشیا بھی شامل ہیں۔ ان میں وہ مسلم ممالک بھی شامل ہیں جو اسرائیل کے حلیف ہیں یعنی متحدہ عرب امارات، بحرین اور مراکش اور وہ بھی جو ابھی تک باضابطہ اسرائیل کے حلیف نہیں بنے۔ مثلاً ترکی، پاکستان، سعودی عرب وغیرہ۔ لیکن اس منصوبے میں شریک تمام شرکاء کے لیے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنا لازم ہے۔ اسرائیل بھی اس امن معاہدے کا رکن ہے اور چونکہ معاہدے کا مقصد اسرائیل کا تحفظ اور پھیلاؤ ہے لہٰذا معاہدے کے تمام شرکاء اسرائیل کی علاقائی بالادستی اور امریکی سامراج کے تسلط کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ ٹرمپ نے بارہا کہا ہے کہ اس معاہدے کے تمام شرکاء کو ابراہیم اکارڈ میں شامل کرنے کی طرف یہ پہلا قدم ہے اور اس ضمن میں سب سے زیادہ دباؤ سعودی عرب، ترکی اور پاکستان پر ڈالا جائے گا۔

اس منصوبے کی جو بھرپور عوامی مزاحمت ہونی چاہیے وہ ناپید ہے۔ پاکستان میں ہم جماعت اسلامی سے توقع رکھتے تھے کہ اس سلسلے میں عوامی مزاحمت منظم کرے گی کیونکہ اس کے امیر نے بارہا حماس کے ہتھیار ڈالنے کی مخالفت کی تھی اور فلسطین کے حق میں عوامی تحرک پیدا کیا تھا۔ جماعت اسلامی مقامی حکومتوں اور شہری حقوق کے حصول کے لیے تسلسل کے ساتھ عوامی مزاحمت کر رہی ہے لیکن امت مسلمہ کے سب سے بڑے مسئلے یعنی فلسطینی جہاد کی اعانت سے دست کش ہو رہی ہے۔ جبکہ اس ایشو پر عوام کو متوجہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس معاملے میں جماعت اسٹیبلشمنٹ کے زیر اثر آ گئی ہے۔ عوامی مزاحمت تو دور کی بات ہے جماعت اسلامی نے اس امن معاہدے کی زبانی مخالفت بھی نہ کی، جیسی کہ جمعیت علماء اسلام اور مجلس وحدت المسلمین کے رہنماؤں نے کی ہے۔ جو مسلم ممالک لبرل جمہوری عمل جاری رکھے ہوئے ہیں، پاکستان، ترکی، انڈونیشیا وغیرہ، ان میں حماس کے حق میں عوامی تحرک کو بیدار کرنا اور امن معاہدہ میں شمولیت سے دست برداری کا مطالبہ کرنا وہاں کی اسلامی جماعتوں کا اولین فریضہ ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی سے کوتاہی اسلامی جماعتوں کے اسلامی تشخص کو شدید طور پر مجروح کر سکتی ہے اور ان پر یہ الزام جائز طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے نازک موقع پر سامراج سے نبرد آزما ہونے سے گریز کر رہی ہیں۔

# بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی کی کامیابی-توقعات اور خطرات

جاوید اکبر انصاری

۲۰۲۶ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی کو اہم کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کو ووٹ ڈالنے والوں کے تقریباً ۹ء۵ فیصد ووٹ ملے جو مجموعی ووٹرز کا ساڑھے سات فیصد بنتے ہیں۔ لیکن اسمبلی میں اس کو ۶۸ نشستیں حاصل ہوئیں جو کہ مجموعی نشستوں کا تقریباً ۲۳ فیصد بنتی ہیں۔ اس کے قائم کردہ اتحاد کو ۷۷ نشستیں حاصل ہوئیں۔

یہ جماعت اسلامی کی سقوط مشرقی پاکستان کے بعد سب سے بڑی انتخابی کامیابی ہے۔ آج جماعت اسلامی بنگلہ دیش ایک اہم سیاسی قوت کے طور پر موجود ہے۔ جماعت کی یہ کامیابی مصر میں اخوان المسلمون کی ۲۰۱۲ء کی کامیابی سے مماثلت رکھتی ہے۔ اخوان کی طرح جماعت اسلامی نے بھی پچھلی نصف صدی کے دوران عدیم المثال قربانیاں دیں نیز قید و بند اور تشدد کی شکل میں تکالیف برداشت کیں۔ نہایت نامساعد حالات میں جماعت کے کارکنوں نے عدیم المثال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ثابت قدم رہے اور دشمن کے ہاتھوں نہیں بکے۔ ان کی یہ پیہم دی گئی قربانیاں تمام اسلامی کارکنوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔ ان شاء اللہ۔

لیکن اخوان کے ۲۰۱۲-۲۰۱۳ء کے تجربات حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوئے۔ مصر کی احتجاجی تحریک میں کئی دہریہ قوم پرست شامل تھے۔ اور یہی حال بنگلہ دیش کی ۲۰۲۳ء کی مزاحمتی تحریک کا بھی تھا۔ دونوں تحریکوں میں اسلامی رنگ غالب نہیں تھا اور دونوں ہی کا مطالبہ سرمایہ دارانہ عدل کا قیام تھا۔ اخوان نے اپنے دور اقتدار میں دہریہ قوتوں اور ان کی پشت پناہ فوج سے مصالحت کا راستہ اختیار کیا اور ایسے اسلامی احکام نافذ نہیں کیے جو دہریہ قوتوں کو کمزور کر سکتے۔ اس نے نہ شریعت کی تنفیذ کا انتظام کیا، نہ سامراجی اداروں سے اپنے روابط منقطع کیے، نہ اسرائیل کے ساتھ اشتراک سے عملاً رجوع کیا۔

۲۰۱۳ء میں امام مرسی رحمہ اللہ کو شہید کر دیا گیا اور اخوان کی حکومت ختم کر دی گئی۔ اخوان

کے اس ناکام تجربے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دہریہ قوتوں کو راضی رکھنے کی کوششوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ خالدہ ضیاء کی حکومت میں جماعت اسلامی شریک کار رہی۔ اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آج بھی ہمیں بی این پی(BNP) سے کوئی توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔ ان کی ماضی کی پالیسیوں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک خالص سرمایہ دارانہ سامراجی حکومت قائم کریں گے۔ ہمیں ایک منفرد اسلامی ایجنڈے کی بنیاد پر ایک مضبوط حزب اختلاف کی حیثیت سے اپنی شناخت متعارف کرانی چاہیے۔

جماعت اسلامی بنگلہ دیش مولانا مودودی کی وارث ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے۔ ہمارا انقلاب لازماً سرمایہ دارانہ نظاماتی انہدام پر منتج ہو گا۔ ہماری انتخابی مہم کا مرکزی نکتہ کرپشن کے خاتمے کا مطالبہ تھا۔ اب ہمیں ثابت کرنا ہے کہ کرپشن کا پھیلاؤ سرمایہ دارانہ ادارتی نظم کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے اور کوئی سرمایہ دارانہ ملک کرپشن کا خاتمہ نہیں کر سکتا۔ سرمایہ دارانہ اداروں کے اختیارات کی تحدید کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں اسلامی اخلاق اور روحانیت فروغ پائے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے دوسری اسلامی جماعتوں کے تعاون سے نوجوانوں کے لیے تعلیم و تربیت کا ایک وسیع پروگرام ترتیب دیا جائے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں:

- حلال رزق کی فراہمی کا فروغ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشارکت اور مضاربت کی بنیاد پر ایک تمویلی نظام قائم کیا جائے۔ اس نظم کا مقصد مخلصین دین کو معاشرتی سطح پر بااختیار بنانا ہو۔

ہر مسجد اپنے علاقے میں مندرجہ ذیل خدمات کی فراہمی کی ذمہ داری سنبھالے:

- محلے اور بازار کی سطح پر عدالتی نظم کی ذمہ داریاں
- محلے اور بازار میں قیمتوں، فیسوں اور کرایے کا تعین اور کنٹرول۔
- حلال رزق کی فراہمی کی اسکیمیں اور سود اور سٹے سے پاک کاروبار کا فروغ
- محلے اور بازار کی سطح پر فواحش اور منکرات کا انسداد

- اسلامی تعلیم، تربیت اور تزکیے کے پروگراموں کا اجرا (بالخصوص نوجوانوں کے لیے)
- محلے اور بازار کی سطح پر بجلی، گیس اور پانی کے فراہمی کے نظام کی نگرانی۔

اس نظام کی کارفرمائی کا مقصد ایک ایسی ریاست درون ریاست قائم کرنا ہے جہاں اقتدار اور قوت نافذہ سرمایہ دارانہ ریاستی اداروں سے منتقل ہو کر بتدریج مخلصین دین کے ہاتھوں میں مرتکز ہوتے چلے جائیں۔

اس نظام کی پشت پناہی وہ ارکان کریں جو جماعت کے توسط سے منتخب ہوئے ہیں۔ ان کی یہ ذمہ داری ہو گی کہ اس نظام کے تحفظ اور توسیع کے لیے جد وجہد کرتے رہیں۔

بنگلہ دیش میں مخلصین دین کی کمی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں شعائر اسلامی کے پابند ہیں اور اسلامی مظاہر سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ مخلصین دین معاشرتی سطح پر کمزور اور لاچار ہیں۔ جماعت اسلامی کی حکمت عملی کا کلیدی ہدف مخلصین دین کی اس محرومی اور بے بسی کو رفع کرنا ہونا چاہیے۔ جماعت اسلامی اس مساعی کے نتیجے میں ایک مستحکم معاشرتی قوت کے طور پر ابھرے گی اور اس کے سیاسی عمل کی معاشرتی بنیادیں مستحکم ہوں گی۔ ان شاء اللہ۔

اس حکمت عملی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ جماعت زیادہ سے زیادہ اسلامی جماعتوں اور گروہوں (سیاسی اور اصلاحی دونوں) کو اپنے ساتھ لے کر چلے۔ جماعت اسلامی بنگلہ دیش کی تحریک اسلامی جماعتوں اور گروہوں کے درمیان رابطے کی جماعت کا کردار ادا کرے۔

# رسالہ اسلامی انقلاب: ایک سالہ سفر کا تنقیدی جائزہ

سید محمد یونس قادری

الحمدللہ! رسالہ اسلامی انقلاب نے اپنا ایک سال مکمل کر لیا ہے۔ یہ رسالہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی فکری سرپرستی میں شروع ہوا، جس میں مدیر، نائب مدیر، معاون مدیران، مدیر منتظم امین اشعر صاحب وغیرہ نہایت فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر رفقاء بھی مختلف سطحوں پر اس کاروان کا حصہ ہیں۔ تحریری سطح پر بالخصوص ذیشان صاحب اور یونس قادری صاحب کی کاوشیں نمایاں رہی ہیں۔ ایک سال کے اس سفر میں ہم نے اسلامی فکر، بالخصوص سرمایہ داری کے تنقیدی مطالعے اور اسلامی نظامِ معیشت کی تشکیل سے متعلق قابلِ قدر مواد جمع کیا، جو بلاشبہ ایک اہم علمی سرمایہ ہے۔

تاہم اگر اس رسالے کو تنقیدی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو چند بنیادی سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں، جن پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے تاکہ آئندہ کے لیے بہتر سمت متعین کی جا سکے۔ سب سے پہلی کمزوری یہ ہے کہ رسالہ نئے لکھاری پیدا کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ عملی طور پر یہ چند محدود ناموں تک سمٹ گیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا زیادہ مواد ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی تحریروں پر مشتمل ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ حالانکہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی فکر کا اصل مقصد شخصیات کی پرستش نہیں بلکہ ایک فکری روایت کی تشکیل ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ لکھیں، سوچیں، سوال کریں اور اظہار کی صلاحیت پیدا کریں۔ ایک سال کے عرصے میں ہم ایسی فضا قائم نہ کر سکے کہ ہمارے دیگر رفقاء تحریری طور پر مؤثر انداز میں اسمیں شامل ہو پاتے۔

دوسرا اہم مسئلہ رسالے کی رسائی (reach) اور تنظیمی ساخت سے متعلق ہے۔ ہمیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ رسالے کے باقاعدہ قارئین یا ممبران کی تعداد کتنی ہے۔ اس کی ترسیل زیادہ تر ذاتی تعلقات اور واٹس ایپ گروپس کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس کی کوئی الگ اور منظم تشہیری ٹیم موجود نہیں جو سوشل میڈیا پر اسے ایک فکری پلیٹ فارم کے طور پر متعارف

کرائے۔ نتیجتاً یہ رسالہ ایک محدود دائرے میں گردش کرتا رہتا ہے اور وہ وسعت حاصل نہیں کر پاتا جو اس کے موضوع اور فکر کا تقاضا ہے۔

تیسری بات یہ کہ رسالہ صرف پی ڈی ایف کی صورت میں دستیاب ہے اور اس کی کوئی طباعتی شکل موجود نہیں۔ اگرچہ ڈیجیٹل دور میں یہ ایک قابلِ فہم حکمتِ عملی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ویب سائٹ، بلاگ، فیس بک پیج، یوٹیوب چینل یا مختصر ویڈیوز جیسے جدید ذرائع کو استعمال نہ کرنا ایک بڑا خلا ہے۔ آج کی فکری جنگ محض تحریر سے نہیں بلکہ ملٹی میڈیا کے میدان میں لڑی جا رہی ہے۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود ایک حقیقت ناقابلِ انکار ہے: اس پورے رسالے کی، بلکہ میں کہوں گا سو فیصد کاوش چند رفقاء جن کا اوپر ذکر ہوا کے سر ہے۔ انہوں نے اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود اس کام کا پورا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا اور اسے نہایت خوبی اور ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا۔ منصوبہ بندی، ترتیب، کمپوزنگ، اشاعت اور ترسیل یہ سب کام عملاً انہی حضرات کے کندھوں پر ہیں۔

اب ایک سال مکمل ہونے کے بعد وقت آ گیا ہے کہ ہم اس رسالے کو محض ایک محدود حلقے کی سرگرمی کے بجائے ایک باقاعدہ فکری تحریک کا آلہ بنائیں۔ نئے لکھاریوں کی تربیت، منظم ادارتی ورکشاپس، واضح پالیسی، تشہیری ٹیم، اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر بھرپور موجودگی، یہ سب وہ اقدامات ہیں جن کے بغیر "اسلامی انقلاب" اپنی حقیقی "صلاحیت" کو بروئے کار نہیں لا سکتا۔

تنقید کا مقصد حوصلہ شکنی نہیں بلکہ سمت کی درستگی ہے۔ اگر ہم اس تنقید کو خلوص کے ساتھ قبول کر لیں تو آئندہ سالوں میں اسلامی انقلاب محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک فکری مدرسہ اور تحریک بن سکتا ہے۔

# تتمہ از مدیران

## تجزیاتی نکات اور تجاویز

### ۱. فکری روایت بمقابلہ شخصیت پرستی

یونس بھائی نے بالکل درست نشاندہی کی ہے کہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی فکر کا مقصد ایک تبدیلیِ فکر (Paradigm Shift) ہے، نہ کہ صرف ان کی اپنی تحریروں کی ترویج۔

تجویز: نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کے لیے رسالے میں ایک مستقل گوشہ "نووارد انِ فکر" یا "تربیتی نشست" کے نام سے شروع کیا جاسکتا ہے، جہاں نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو ڈاکٹر صاحب یا دیگر سینئر رفقاء کی اصلاحی آراء کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اس سے لکھنے والوں میں اعتماد پیدا ہو گا

### ۲. رسائی اور جدید میڈیا کا خلا

موجودہ دور میں تحریری مواد کی اہمیت مسلم ہے، لیکن اس کی اثر پذیری اس وقت تک محدود رہتی ہے جب تک اسے Multi-modal طریقے سے پیش نہ کیا جائے۔

ڈیجیٹل انفراسٹرکچر: رسالے کے لیے ایک سادہ مگر باقاعدہ ویب سائٹ یا بلاگ ناگزیر ہے، جہاں مضامین کی درجہ بندی (Indexing) ہو سکے۔

سوشل میڈیا حکمتِ عملی: ہر شمارے کے اہم نکات پر مبنی پانچ منٹ کی Short Videos یا انفرافکس (Infographics) بنا کر فیس بک اور یوٹیوب پر شیئر کرنا رسائی کو کئی گنا بڑھا سکتا ہے۔

### ۳. تنظیمی ڈھانچہ اور ممبر شپ

جب تک قاری کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ ایک تحریک کا حصہ ہے، وہ محض ایک "ناظر" ہی رہتا ہے۔

قارئین کا ڈیٹا بیس: ایک منظم گوگل فارم کے ذریعے باقاعدہ قارئین کی رجسٹریشن ہونی

چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ فکری اثر و رسوخ کن طبقات (طلباء، اساتذہ، علمائے کرام) میں زیادہ ہے۔

## ششماہی ایکشن پلان: "منزلِ انقلاب"

اس منصوبے کو تین مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے:

مرحلہ ۱: تنظیمی استحکام اور ڈھانچہ سازی (پہلا اور دوسرا مہینہ)

سب سے پہلے کام کے بوجھ کو چند افراد کے کندھوں سے ہٹا کر تقسیم کرنا ضروری ہے۔

ادارتی ورکشاپس: ڈاکٹر ذیشان ارشد اور یونس قادری کے زیرِ نگرانی ماہانہ ایک آن لائن نشست ہو، جس کا مقصد نئے لکھنے والوں کو "اسلامی نظامِ معیشت" اور "سرمایہ داری کے رد" پر لکھنا سکھانا ہو۔

شعبہ جات کا قیام: تحریر، گرافکس، اور سوشل میڈیا کے لیے الگ الگ رضاکاروں کی ٹیم تشکیل دی جائے۔

ڈیٹا بیس کی تیاری: واٹس ایپ اور ای میل کے ذریعے قارئین کا ایک باقاعدہ ریکارڈ بنایا جائے تاکہ ان سے فیڈ بیک لیا جا سکے۔

مرحلہ ۲: ڈیجیٹل ظہور اور رسائی (تیسرا اور چوتھا مہینہ)

صرف پی ڈی ایف پر انحصار ختم کر کے مواد کو ہر جگہ دستیاب بنانا۔

ویب سائٹ / بلاگ کا قیام: جہاں پچھلے تمام شماروں کے مضامین انفرادی طور پر (Article-wise) پڑھے جا سکیں۔ یہ سرچ انجن کے لیے بھی ضروری ہے۔

ملٹی میڈیا مواد: ہر اہم مضمون کا ایک "Executive Summary" کارڈ (گرافک) بنایا جائے اور اہم پیراگراف کی آڈیو ریکارڈنگ (Podcast style) جاری کی جائے۔

سوشل میڈیا مہم: فیس بک اور ٹویٹر (X) پر مخصوص ہیش ٹیگز کے ساتھ بحث کا آغاز کرنا۔

مرحلہ ۳: علمی توسیع اور طباعت (پانچواں اور چھٹا مہینہ)

موضوعاتی شمارے: مخصوص اہم موضوعات (مثلاً: مصنوعی ذہانت اور اسلام، یا ماحولیاتی

بحران اور سرمایہ داری) پر خصوصی شمارے لائے جائیں تاکہ علمی حلقوں میں توجہ حاصل ہو۔
پرنٹ آن ڈیمانڈ (Print on Demand): اگر مکمل طباعت مشکل ہو، تو کم از کم سالانہ بنیادوں پر تمام شماروں کو ایک کتابی شکل (Bound Volume) میں شائع کیا جائے تاکہ وہ لائبریریوں کی زینت بن سکے۔

## مجوزہ نئی ادارتی پالیسی (Editorial Policy)

رسالے کے معیار اور تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے درج ذیل اصول اپنائے جاسکتے ہیں:
تنوع (Diversity): ہر شمارے میں کم از کم ۲۰٪ مواد نئے یا نوجوان لکھاریوں کا ہونا لازمی قرار دیا جائے۔
سادگی و ابلاغ: علمی گہرائی برقرار رکھتے ہوئے زبان کو اتنا سادہ رکھا جائے کہ مدارسِ اور یونیورسٹی کا ایک عام طالب علم بھی اسے سمجھ سکے۔
مکالمہ: "خطوط اور آراء" کا ایک مستقل کالم شروع کیا جائے جہاں قارئین کے سخت سوالات کے جوابات ڈاکٹر صاحب یا سینئر رفقاء دیں۔

## اگلا قدم

اس منصوبے کو حقیقت بنانے کے لیے پہلا قدم ایک "رضاکارانہ فارم" جاری کرنا ہو سکتا ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ کون سا دوست کس شعبے (لکھنا، ڈیزائننگ، ویب سائٹ یا مارکیٹنگ) میں اپنا وقت دے سکتا ہے۔
رسالہ اسلامی انقلاب: رضاکارانہ رجسٹریشن فارم (مجوزہ خاکہ)
یہ فارم ان رفقاء کے لیے ہے جو رسالہ "اسلامی انقلاب" کو ایک منظم فکری تحریک بنانے میں اپنا عملی تعاون پیش کرنا چاہتے ہیں۔
۱. بنیادی معلومات
-نام:

- تعلیمی قابلیت / پیشہ:
- شہر:
- رابطہ نمبر (واٹس ایپ):

۲. تعاون کے شعبہ جات (براہِ کرم انتخاب کریں)

- تحریر و تحقیق: (مضامین لکھنا، ترجمہ نگاری، یا کتب کی تلخیص)
- ادارتی معاونت: (پروف ریڈنگ، مواد کی ترتیب، یا نئے لکھاریوں کی اصلاح)
- ڈیجیٹل میڈیا: (گرافک ڈیزائننگ، ویڈیو ایڈیٹنگ، یا سوشل میڈیا مینجمنٹ)
- تکنیکی معاونت: (ویب سائٹ بنانا، ایپ ڈویلپمنٹ، یا ڈیٹا بیس مینجمنٹ)
- نظم و ترسیل: (ممبر شپ مہم، تشہیر، اور رسالے کی تقسیم)

۳. تجربہ اور مہارت

- کیا آپ پہلے بھی کسی رسالے یا تحریک سے وابستہ رہے ہیں؟ (مختصر تفصیل)
- آپ ہفتے میں کتنا وقت (گھنٹوں میں) اس کام کے لیے وقف کر سکتے ہیں؟

۴. تجاویز

- رسالے کو بہتر بنانے کے لیے آپ کی کوئی خاص تجویز؟

# رسائل و مسائل

# کھلا خط

بخدمت امیر محترم مجلس وحدت المسلمین؛ بخدمت امیر محترم جماعت اسلامی پاکستان!

آج ایران کی اسلامی حکومت پر بلوائی دہریے حملہ آور ہیں اور ان کو اس میں سامراج کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ آج دنیا میں ایران اسلام کا مضبوط ترین قلعہ ہے اور فلسطین میں جہاد جاری رکھنے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ اگر یہ قلعہ مسمار ہو گیا تو یہ ہر اسلامی تحریک کے لیے پسپائی ہو گی۔ اس سلسلے میں ایک بنیادی خطرہ یہ موجود ہے کہ امریکا اپنے حلیف ممالک (پاکستان، بحرین، عراق) وغیرہ سے ایران پر حملے کے لیے فوجی سہولتیں طلب کرے گا۔ اس قسم کی سہولت کو ناممکن بنانے کے لیے عوامی تحرک ضروری ہے۔

آپ دونوں کی جماعتیں حکومتِ اسلامی کے دفاع کے حق میں ملک گیر مظاہرے منعقد کر سکتی ہیں اور اس میں کوتاہی تحریک اسلامی کے لیے نہایت مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم فلسطین میں جہاد کی اصل بنیاد ایران کی اسلامی حکومت کے انہدام کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کریں تو فلسطین کے حق میں نعرہ بازی بے معنی ہے۔

پاکستانی قوم کو متحرک کرنا ایرانی اسلامی حکومت کے تحفظ کے لیے اور پاکستانی حکومت کو امریکی مطالبات کو رد کرنے پر مجبور کرنے کے لیے ہے۔ آپ دونوں کی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ اس ایشو پر پاکستانی عوام کو متحرک اور منظم کریں۔

جماعت اسلامی نے ملک گیر مظاہروں اور مطالبات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں ایران کی اسلامی حکومت کے تحفظ کے مطالبے کو شامل کیا جائے۔ وحدت المسلمین پاکستان میں پائی جانے والی شیعہ برادری کو موبلائز کرے۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارے شیعہ حلقے ایران کی اسلامی حکومت کے دفاع سے لاتعلق نظر آتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ سڑکوں پر آ کے اعلان کریں کہ اسلامی حکومتِ ایران کا دفاع اسلام کا دفاع ہے۔

آپ دونوں سے گزارش ہے کہ متحد ہو کر پاکستان میں ایران کی اسلامی حکومت کے دفاع میں عوامی مہم مرتب فرمائیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

جاوید اکبر انصاری

# خط بنام محترم امیر جماعت مجلس وحدت مسلمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سندھ بھر میں جہاد فلسطین اور ٹرمپ کے معاہدے کے سلسلے میں جو نہایت کامیاب مظاہرے مجلس نے کیے وہ آپ سب کو بہت بہت مبارک ہوں۔ یہ مظاہرے امت کے دل کی آواز ہیں اور شیعہ سنی اتحاد کی بہترین مثال ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی جلیلہ کو قبول فرمائے اور مجلس کے ارکان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

ٹرمپ معاہدے سے پاکستان کی دست برداری ممکن بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مجلس اپنی مہم کو ملک گیر سطح پر چلائے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ مجلس پہلے قدم کے طور پر ٹرمپ منصوبے کے خلاف ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرے۔ مسلم لیگ (ن) کے علاوہ تمام سیاسی اور دعوتی جماعتوں کو مدعو کریں۔ اس کانفرنس میں تحریک انصاف جو آپ کی حلیف جماعت ہے، جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، شیعہ علماء کونسل اور اگر ممکن ہو سکے تو تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی پر مشتمل ایک مجلس عاملہ قائم کی جائے جو مجلس وحدت المسلمین کی صدارت میں جہاد فلسطین کے حق میں اور ٹرمپ معاہدے کی منسوخی کے لیے ملک گیر اجتماعی مہم کو منعقد کرنے کی ذمہ داری قبول کرے۔

آپ نے یہ کام نہیں کیا تو کوئی دوسری جماعت نہیں کرے گی۔ کیونکہ سب پر اسٹیبلشمنٹ کو راضی رکھنے کی جستجو غالب ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی جماعت ہی کی ذمہ داری ہے کہ پاکستانی امت مسلمہ کی قیادت فرمائیں۔

اس احتجاجی ملک گیر مہم کا ایک جزو اسلامی جمہوریہ ایران کا دفاع بھی ہونا چاہیے جس پر سامراج حملہ آور ہے اور جو جہاد فلسطین کا واحد ساتھی اور پشتیبان ہے۔

والسلام

جاوید اکبر انصاری

# قارئین کے خطوط

از مولانا غلام اسحاق صاحب

السلام علیکم رضوی صاحب۔

میں نے آپ حضرات کے چاروں رسائل منگوائے اور پڑھنا شروع کیا۔ ان میں آپ نے مخاطبین میں مدارس کے طلباء و اساتذہ کو بھی شمار کیا ہے لیکن آپ حضرات کی اس میں زبان بہت مشکل ہے ایک ایک جملے کو کئی بار دیکھنا پڑھتا ہے اور اصطلاحات بھی بہت مشکل لگیں۔ دوسرا جمعیت علمائے اسلام بھی ایک انقلاب برپا کرنے والے نوجوانوں سے بھری جماعت ہے لیکن آپ کے رسالے میں ان کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا۔

والسلام

غلام اسحاق

جناب مولانا غلام اسحاق صاحب

آپ کی تمام تجاویز بجا ہیں اور انشاء اللہ آہستہ آہستہ ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ پچھلے شمارے میں تفہیم مغرب کے نام سے ڈاکٹر ذیشان ارشد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، وہ آپ کے ارشادات کے تناظر میں ہی شائع کیا گیا تھا اور ذیشان بھائی اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

جمیعت علماء اسلام اور خاص طور پہ حضرت مولانا فضل الرحمن دام ظلہ سے ہمارے گہرے تعلقات ہیں اور ہمارے ڈاکٹر انصاری صاحب نے ہمیشہ مولانا کا دفاع کیا ہے۔ جمعیت علماء اسلام کا ہمارے نزدیک اصل کام اسلامی معاشرتی اداروں کا موجودہ پاکستانی ریاستی اور سیاسی اداروں کے اندر رہتے ہوئے دفاع ہے اور دوسرا کام اتحاد امت کا ہے اور ہماری جو بھی تجاویز

آتی ہیں ان میں ہمیشہ جمیعت علماء اسلام کا نام ان دونوں کاموں کے تناظر میں سر فہرست ہوتا ہے۔ انشاءاللہ آئندہ کوشش کریں گے کہ جمیعت علماء اسلام کے کام اور ہمارے اس سے تعلق کو مزید نمایاں طور پر پیش کریں۔

آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ آپ اسلامی انقلاب میں لکھیں اور دیگر علماء کرام اور خاص طور پر جمیعت علمائے اسلام سے متعلق علماء سے درخواست کریں کہ وہ بھی ہمارے رسالے کی سرپرستی فرمائیں۔

والسلام

احقر العباد

علی محمد

# بیاد ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

# ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی رحلت پر خراجِ عقیدت

سید یونس قادری

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی رحلت محض ایک فرد کا انتقال نہیں، بلکہ ایک عہد، ایک فکر اور ایک علمی روایت کا اختتام محسوس ہوتی ہے۔ وہ ان چند اہلِ نظر میں سے تھے جنہوں نے تحریکاتِ اسلامی کی انقلابی روح کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس کا گہرا علمی محاکمہ بھی کیا، اور اسے ایک مربوط فکری نظام کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

وہ مسلسل اس حقیقت کو واضح کرتے رہے کہ عالمِ اسلام کا اصل تصادم کسی ایک ریاست، قوم یا تہذیب سے نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر نظام — سرمایہ دارانہ نظام — سے ہے، جس نے پوری دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ ان کے نزدیک اس نظام کا مقابلہ جزوی اصلاحات یا وقتی اقدامات سے نہیں، بلکہ ایک ہمہ جہت اسلامی نظام کے قیام سے ہی ممکن ہے، جو ریاست، معاشرت اور فرد تینوں سطحوں پر اپنی جڑیں مضبوط کرے۔

ڈاکٹر صاحب کی فکر کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ انہوں نے سرمایہ داری کو محض ایک معاشی ڈھانچہ نہیں، بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات کے طور پر سمجھا اور اسی بنیاد پر اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ انہوں نے عالمِ اسلام کو یہ شعور دیا کہ ہمارا مقابلہ کسی ایک پالیسی یا ادارے سے نہیں، بلکہ ایک پورے نظام سے ہے، جس کے مقابلے کے لیے ایک متبادل نظام کی تشکیل ناگزیر ہے۔

ایرانی انقلاب سے لے کر افغانستان کی اسلامی ریاست تک، ان کی فکری و پالیسی بصیرت کا محور یہی رہا کہ اسلامی نظام کو عملی صورت میں کیسے غالب کیا جائے۔ انہوں نے ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر کو ایک نئے زاویے سے سمجھا، اس کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا جن سے خود جماعت اسلامی بھی پوری طرح آگاہ نہ تھی، اور ساتھ ہی اس پر ایسی مثبت و تعمیری تنقید کی

جس نے اس فکر کو مزید جِلا بخشی۔

ان کی ایک بڑی علمی خدمت یہ بھی ہے کہ انہوں نے انقلابی اور اصلاحی تحریکات کے درمیان موجود خلیج کو کم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ حقیقی تبدیلی کے لیے دونوں جہتوں کا امتزاج ناگزیر ہے—نہ صرف نظام کی سطح پر انقلاب، بلکہ فرد اور معاشرے کی سطح پر مسلسل اصلاح۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی رحلت ایک ایسا خلا چھوڑ گئی ہے جسے پُر کرنا آسان نہیں۔ ان کی فکر، ان کا اسلوبِ استدلال، اور ان کی جراتِ اظہار آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ رہے گی۔

ڈاکٹر صاحب کی فکر کو میرے نزدیک تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا حصہ: علمی و فکری محاذ

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ مغرب کا نظام سرمایہ داری ہے، اور اس کی علمیت جاہلیت خالصہ ہے۔ اس کے لیے انھوں نے مغربی مفکرین سے استفادہ کرتے ہوئے ثابت کیا کہ سرمایہ داری ایک جاہلانہ نظام ہے۔ یعنی سرمایہ داری کو اس کے اپنے مفکرین کے ذریعے پڑھایا، جس میں فلسفی حضرات کے افکار اور نظریات ہمیں سکھانے کی کوشش کی گئی۔ ہمارے حلقے میں موجود فلسفی حضرات اور دیگر ساتھیوں نے اس علمی مباحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کی مکمل تفہیم ان کو حاصل ہے، اور بڑی خوبی کے ساتھ اسے بیان بھی کر رہے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد اس فکری محاذ پر کوئی خاص خلا محسوس نہیں ہو رہا۔

دوسرا حصہ: عملی انقلابی کام

یہ سرمایہ دارانہ نظام کو شکست دے کر اس کی جگہ اسلامی نظام کو نافذ کرنے اور اس کی حکمت عملی طے کرنے کا کام ہے۔ یہ ایک سیاسی جدوجہد سے مربوط معاملہ ہے، جس میں معاشرت اور فرد کی اصلاح کی حکمت عملی مشروط ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب مسلسل جماعت اسلامی اور حالیہ دنوں میں افغانستان کی طالبان حکومت کو مشورے دیتے تھے کہ کس طریقے

سے اسلامی نظام کے غلبہ کو افغانستان میں ممکن بنایا جائے۔ میرے نزدیک اس حلقے میں کوئی سیاسی مفکر نظر نہیں آتا۔ پاکستان کے تناظر میں، اگر ہمارے وہ رفقا جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں یا رکھتے تھے، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی تحریروں کا دوبارہ مطالعہ کریں تو وہ اس کمی کو کافی حد تک پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بشرطیکہ وہ حالیہ سیاسی پہلوؤں پر یوٹیوب اور واٹس ایپ کی بجائے اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کریں اور ان واقعات کا تجزیہ تحریری صورت میں کریں۔

تیسرا حصہ: پالیسی سازی اور تعمیراتی کام

سرمایہ داری کا مقصد معاشی نظام کے تحت پورے معاشرے اور ریاست کو اپنے تابع کرنا ہے، اور سرمایے کی بڑھوتری مالیاتی اداروں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہ کام بڑی تحقیق کا متقاضی ہے۔ یہ پالیسی سازی کا کام ہے کہ اسلامی ریاست کس طرح سرمایہ دارانہ نظام کو کمزور یا تباہ کر کے اس کی جگہ اسلامی اداروں کا قیام ممکن بناتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حالیہ دنوں میں افغانستان کی طالبان حکومت کو عملی مشورے اور پلاننگ کے مسودے دیے ہیں کہ کس طریقے سے اسلامی نظام کے غلبہ کو افغانستان میں ممکن بنایا جائے۔ مزید یہ کہ ان کے نفاذ میں حائل مسائل اور حل سے سیکھا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کے بعد ہمیں ان تینوں سطحوں پر الگ الگ اور باہم مربوط ہو کر کام کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر صاحب کو فلسفے پر مکمل عبور حاصل تھا، پلاننگ کے تو وہ بادشاہ تھے، اور وہ خود کہتے تھے کہ ان کی اصل فیلڈ پولیٹیکل اکنامکس ہے۔ کوئی ایک شخص ان کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا، بلکہ ان تینوں شعبوں میں مختلف گروہ کام کریں اور ان کو ایک جگہ مربوط کریں۔ یہی اصل ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے، اور ہمیں ان کے فکری ورثے کو سمجھنے اور آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

# ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

عارف الحق عارف

پاکستان کے ممتاز ماہر معاشیات و فلسفہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی رحلت کی خبر نے افسردہ کر دیا ہے۔ یہ خبر ان کے برادر نسبتی اور ہمارے دوست تحسین انصاری نے مشیگن امریکہ سے ابھی ابھی دی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کراچی یونیورسٹی میں ہمارے دور طالب علمی میں اسلامی جمیعت طلبہ کے ناظم تھے اور معاشیات کے ذہین ترین طالب علم کی شہرت رکھتے تھے۔ اپنے شعبہ معیشت کے علاوہ جدید اور قدیم علوم کی کتابیں پڑھنے میں مشہور تھے اس وجہ سے ان کو اس وقت ایک وسیع المطالعہ طالب علم کے طور پر جانا جاتا تھا۔ کلاس کے علاوہ وہ زیادہ تر یونیورسٹی کی محمود حسین لائبریری ہی میں پائے جاتے تھے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات کرنے کے بعد وہ پی ایچ ڈی کے لیے لندن چلے گے اور اعلی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور کارل مارکس اور اس کے معاشی فلسفے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی[۱]۔

پی ایچ ڈی حاصل کرنے کے بعد ان کو ان کی معاشیات میں بہترین قابلیت کی بنا پر اقوام متحدہ کے ایک ادارے (International fund for agricultural development) میں ملازمت مل گئی [۲] اور وہ ویانا منتقل ہو گئے جہاں سابق وزیر خزانہ پاکستان سر تاج عزیز کے ساتھ کام کرنے لگے جو پہلے ہی وہاں موجود تھے اور اس ادارے میں اعلی عہدے پر فائز تھے۔ سر تاج عزیز ان کے تعلیمی قابلیت سے بڑے متاثر تھے۔

ان کو اقوام متحدہ کی یہ ملازمت ان کے بہترین تعلیمی کیریئر کی وجہ سے ملی تھی۔ ابھی وہ وہیں کام کر رہے تھے کہ بھٹو حکومت کی آمریت اور جبر کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی ملگ گیر تحریک کے نتیجے میں ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا۔ ۱۹۷۸ میں مختصر مدت

کے لیے قومی اتحاد کی کچھ جماعتیں مسلم لیگ، جمیعت علمائے اسلام، خاکسار تحریک، پاکستان جمہوری پارٹی اور جماعت اسلامی ملک میں انتخابات کی شرط پر حکومت میں شامل ہوئیں تو جماعت سے پروفیسر غفور احمد، چودھری رحمت الٰہی اور پروفیسر خورشید احمد وزیر بنے۔ پروفیسر خورشید احمد کو پلاننگ کمیشن کا چیئرمین بنایا گیا ان کا مقصد ملک کی معیشت کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنا تھا۔ ان کو اپنے اعتماد کی ٹیم کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے جاوید اکبر انصاری کو ویانا سے پاکستان بلوالیا۔ وہ پروفیسر خورشید کا اپنا استاد ہونے اور نظریاتی ہم آہنگی[۳] کی وجہ سے بڑا احترام کرتے تھے۔ اس لیے انکار نہ کر سکے اور کچھ عرصے کے لیے چھٹی لے کر پاکستان آگے جہاں انہیں ایک ٹاسک فورس کا سربراہ بنایا گیا لیکن اپنی آزاد سوچ کی وجہ سے زیادہ عرصہ ان کے ساتھ نہ چل سکے اور واپس ویانا چلے گے اور پھر وہ وہیں کام کرتے رہے۔

وہ ۱۹۸۰ کے عشرے کے آخر میں کراچی واپس آگے اور خود کو تعلیمی اور تصنیفی مصروفیات تک محدود کر لیا۔ انہوں نے کراچی میں کئی تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھنے میں سرگرم حصہ لیا اور ان کو معتبر تعلیمی اداروں میں بدل دیا۔ ان میں کے بی ایم (کالج آف بزنس منیجمنٹ) کورنگی کریک، کے آئی ای ٹی (کراچی انسٹیٹیوٹ آف اکنامکس اینڈ ٹیکنالوجی) اور صفا یونیورسٹی شامل ہیں وہ ان اداروں میں ڈین کے عہدوں پر فائز رہے اور طلبہ میں اپنا علم بانٹتے رہے۔

جاوید اکبر انصاری نے تدریس کے ساتھ ساتھ اپنا فکری سفر بھی جاری رکھا اور کراچی میں اپنے ہم خیالوں کا ایک بڑا حلقہ جمع کر لیا جو بعد میں دبستانِ جاوید اکبر انصاری کے نام سے مشہور ہوا۔

وہ ایک موثر پلیٹ فارم بن گیا اور اس کے لیکچر زوم کے ذریعے دنیا بھر میں سنے جانے لگے۔ اسی دوران انہوں نے الگ سے مختلف فورموں پر لیکچرز کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ساتھ میں تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہے اور کئی کتابوں کے مصنف بن گئے۔ ان کی

مشہو کتابوں میں مغربی تہذیب کا اساسی نظام اور اس کی استعماری توسیع، سرمایہ دارانہ نظام، سرمایہ داری کیا ہے؟ جمہوریت کی حقیقت، فلسفہ جدید کی مغربی تفہیم، سرمایہ داری کے نقیب اور ریجیکٹنگ فریڈم اینڈ پروگریس شامل ہیں۔ ان کے انگریزی اور اردو مقالات بھی مختلف انگریزی اور اردو جرائد اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

جاوید اکبر انصاری کراچی یونیوسٹی میں اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران اسلامی جمیعت طلبہ کے باصلاحیت اور کامیاب ناظم تھے۔ وہ سینٹ پیٹرکس کانونٹ اسکول سے یونیورسٹی میں آئے تھے اور انگریزی اور اردو کے بہترین مقرر ہونے کے ساتھ ہر کام سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کو یونیورسٹی میں این ایس ایف کے محمد شوکت اور لبرل کے جاوید جبار جیسے لائق مخالف ملے تھے اس لئے وہ ان کا مقابلہ بھی بڑی تیاری سے کرتے اور کامیاب ہوتے تھے۔ وہ سورج مکھی تھے اور ان کو سورج کی روشنی میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس جسمانی کمزوری کے باوجود ان کی سرگرمیوں اور انگریزی کتب کے مطالعے میں فرق نہیں آتا تھا۔ ان کو اگر یونیورسٹی کے انتظامی بلاک کے سامنے میدان میں کوئی غور کرتا ہوا دیکھ لیتا تو آرٹس لابی اور پوری یونیورسٹی میں فوری طور پر افواہ پھیل جاتی کہ جمیعت کچھ بڑا کام کرنے جارہی ہے اور مخالف تنظیمیں خبردار ہو جاتیں اور مقابلے کی تیاری کر لیتیں۔

جاوید اکبریوں تو جمیعت کے سارے کارکنوں کے ساتھ مہربان تھے اور محبت کے ساتھ ان سے رابطہ رکھتے اور ان سے کام لیتے تھے لیکن نظم کی پابندی میں بڑے سخت بھی تھے۔ ہم سے ان کی خصوصی محبت تھی اور ہم پر زیادہ مہربانی فرماتے تھے۔ جب بھی ملتے تو زور کا قہقہ لگا کر استقبال کرتے۔ ان کا کھل کھلا کر قہقہ لگانا پوری یونیورسٹی میں مشہور تھا۔ ہمیں یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں داخل ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ ۱۶ اپریل ۱۹۶۷ کو ہمیں روزنامہ جنگ کے ادارتی عملے میں ملازمت مل گئی۔ اس کی اطلاع جاوید بھائی کو ہوئی تو بڑے خوش ہوئے اور مبارک دیتے ہوئے کہنے لگے ہمیں اب ایک صحافی کارکن بھی مل گیا ہے۔ کانونٹ اسکول میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے وہ اردو پڑھ تو لیتے تھے لیکن لکھ نہیں سکتے

تھے[۴]۔ اس کا علم ہمیں اس وقت ہوا جب ایک بار انہوں نے ہمیں بتایا کہ "روزنامہ جنگ میں کسی مستشرق کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اسلام کے بارے میں کئی بے بنیاد باتوں کا ذکر ہے جس سے غلط فہمیاں پھیل سکتی ہیں۔ میں اس کا جواب ایک مضمون میں دینا چاہتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اردو لکھ نہیں سکتا۔ آپ کوئینز روڈ (مولوی تمیز الدین روڈ) پر میرے گھر آجائیں۔ میں آپ کو اپنا جوابی مضمون لکھوادوں گا وہ آپ جنگ میں اس مستشرق کے مضمون کے جواب کے طور پر چھپوا دیں۔ ہم ان کے بتائے ہوئے پتے پر ان کے گھر پہنچے۔ یہ گھر ان کے والد ہمایوں اختر انصاری کو سرکاری طور پر ملا ہوا تھا جو اس وقت وفاقی حکومت میں ڈپٹی آڈیٹر جنرل تھے۔ جاوید اکبر ہمارا انتظار کر رہے تھے اور ڈکٹیشن کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے مضمون لکھوانا شروع کر دیا۔ وہ زبانی بول رہے تھے اور ہم لکھ رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی کتاب موجود نہیں تھی اور نہ ہی وہ نوٹس یا لکھے پوائنٹس دیکھ رہے تھے۔ وہ اسلام اور عیسائیت پر کتابوں کے حوالے ان کے صفحات کے ساتھ فر فر بیان کر رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جاوید بھائی کو کیا غضب کا حافظہ عطا کیا ہے۔ وہ مضمون ہم نے جنگ میں دو اقساط میں شائع کرایا اور ان کو بتایا تو ان کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

جاوید اکبر انصاری پوری زندگی اسلامی کاز کے لیے کام کرتے رہے۔ انہوں پاکستان میں اسلامی جمعیت طلبہ سے اسلامی تحریک میں کام شروع کیا اور پاکستان، برطانیہ، آسٹریا، ملیشیا اور ایران میں اس کام کو جاری رکھا اور فکری رہنمائی فراہم کرتے رہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ جاوید اکبر انصاری نے سوگواروں میں اپنی اہلیہ انجم انصاری اور اور دو بیٹوں بیرسٹر حسین انصاری اور محمد متین انصاری اور ہزراروں شاگردوں اور احباب کو چھوڑا ہے۔

## نوٹس و حوالہ جات

۱۔ عارف الحق عارف صاحب کا یہ بیان کہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری نے 'کارل مارکس اور اس کے

معاشی فلسفے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی'، غالباً ڈاکٹر صاحب کے اس گہرے فکری شغف اور مطالعے کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے مارکسی معیشت کے تقابلی جائزے پر صرف کیا۔ تاہم، یونیورسٹی آف سسیکس (University of Sussex) کے ریکارڈ کے مطابق ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا اصل عنوان 'UNCTAD: Objectives and Performance 1964-1976' (آنکٹاڈ: مقاصد اور کارکردگی ۱۹۶۴-۱۹۷۶) تھا۔ یہ مقالہ دسمبر ۱۹۷۸ میں شعبہ معاشیات (Department of Economics) میں جمع کرایا گیا (نمبر: ۰۳۸۳)۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کا مرکز عالمی تجارتی نظام میں موجود 'سٹرکچرل' خرابیاں تھیں جنہیں سمجھنے کے لیے انہوں نے مارکسی اور اسٹرکچرلزم کے فلسفوں کا ناقدانہ مطالعہ کیا تھا، اس لیے ان کی علمی شناخت میں ان دونوں پہلوؤں کو یکجا کر دیا جاتا ہے۔

۲۔ عارف الحق عارف صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی اقوامِ متحدہ میں ملازمت کے حوالے سے IFAD کا ذکر کیا ہے، تاہم قرائن اور ڈاکٹر صاحب کے ویانا میں قیام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دراصل UNIDO (یونائیٹڈ نیشنز انڈسٹریل ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن) میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس تصحیح کی بنیاد درج ذیل حقائق پر ہے:

ا۔ جائے ملازمت: IFAD کا صدر دفتر روم (اٹلی) میں ہے، جبکہ ڈاکٹر صاحب کا طویل قیام ویانا (آسٹریا) میں رہا، جو کہ UNIDO کا مرکز ہے۔

۲۔ علمی کام: ان کی اہم کتاب The International Economy and Industrial Development (۱۹۸۲) اسی دور کی یادگار ہے، جس کے شریک مصنف رابرٹ بیلانس (Robert Ballance) بھی UNIDO سے وابستہ تھے۔

۳۔ ذاتی یادداشت (بقول علی رضوی): ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے اپنی گفتگو اور یادداشتوں میں متعدد بار اس بات کی تصدیق کی کہ وہ ویانا میں قیام کے دوران UNIDO ہی میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عارف صاحب کو غالباً یہ تسامح سر تاج عزیز صاحب کی IFAD سے طویل وابستگی کی وجہ سے ہوا۔

[عارف الحق عارف صاحب کے مضمون میں مذکور ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی زندگی کے بعض پہلوؤں کے حوالے سے کچھ اور چیزیں یاد آئیں۔

عارف صاحب نے اقوامِ متحدہ کے ادارے IFAD کا ذکر کیا ہے، لیکن حقیقت میں ڈاکٹر صاحب کا تعلق UNIDO (ویانا) سے تھا۔ اس حوالے سے میرے پاس ایک بہت ہی خوبصورت ذاتی

یاد گار ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں انگلستان میں مقیم تھا، تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے ویانا سے ایک خط لکھا تھا۔ اس وقت وہ مستقل طور پر پاکستان منتقل ہو چکے تھے، لیکن UNIDO کے ساتھ بحیثیت 'کنسلٹنٹ' ان کا پیشہ ورانہ تعلق بر قرار تھا اور وہ ہر سال کچھ ماہ کے لیے ویانا جایا کرتے تھے۔ یہ خط ان کی وہاں موجودگی اور ادارے سے مسلسل وابستگی کا ایک عینی ثبوت ہے۔

اسی ادارے کے حوالے سے وہ اپنے مخصوص قہقہے اور مخصوص انداز میں یہ 'لطیفہ' سنایا کرتے تھے کہ UNIDO اقوامِ متحدہ کی وہ واحد تنظیم ہے جس نے امریکہ کو اپنی تنظیم سے خارج کر دیا تھا (یا مراد یہ تھی کہ امریکہ اس کی پالیسیوں سے تنگ آ کر خود نکل گیا)۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کو اس ادارے کی 'اسٹرکچرل' اہمیت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم ریسرچ رپورٹ (یا تحریر) جو یونیڈو (UNIDO) سے شائع ہوئی تھی کا یہ نکتہ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اسلامی ممالک میں ایران کا ٹیکنالوجی انڈیکس سب سے بلند ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اقتصادی پابندیاں حقیقت میں ایک قوم کو 'سیلف ریلائنس' (خود کفالت) کی طرف لے جاتی ہیں، بشرطیکہ ریاست کے مقاصد بلند ہوں۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ حقیقی اقتصادی ترقی کا مقصد یہ نہیں کہ ایک ملک محض مادی اشیاء کا صارف (Consumer) بن جائے، بلکہ اصل ترقی یہ ہے کہ وہ ٹیکنالوجی اور دفاع میں خود مختار ہو۔ آج کے عالمی حالات اور ایران کی دفاعی و ٹیکنالوجیکل پیش رفت نے ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیے کی حقانیت کو پوری دنیا پر ثابت کر دیا ہے۔]

۳۔ اگرچہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے اپنی ذاتی گفتگو اور عوامی خطابات میں پروفیسر خورشید احمد صاحب کے ساتھ اپنے گہرے ذاتی تعلق اور احترام کا ہمیشہ اعتراف کیا، لیکن علمی اور نظریاتی طور پر وہ ان کے سخت ترین ناقد تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک پروفیسر خورشید احمد کا معاشی و سیاسی وژن اسلامی انقلاب کے اساسی تقاضوں پر پورا نہیں اترتا تھا۔

۱۔ علمی حیثیت: ڈاکٹر صاحب، پروفیسر خورشید احمد کو کوئی اعلیٰ درجے کا معیشت داں (Economist) تسلیم نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے نزدیک ان کا کام محض اصلاحاتی یا جزوی نوعیت کا تھا جس میں عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی ڈھانچے کو چیلنج کرنے کی صلاحیت موجود نہ تھی۔

۲۔ نظریاتی تصادم: ڈاکٹر صاحب 'اسلامائزیشن' (اسلامی بنانا) کے اس ماڈل کے خلاف تھے جس کے علمبردار پروفیسر خورشید احمد تھے۔ ان کے نزدیک یہ ماڈل سرمایہ داری کے اندر رہتے ہوئے اسے اسلامی لبادہ پہنانے کی کوشش تھی، جبکہ ڈاکٹر صاحب کا موقف 'سرمایہ داری کا کلی رد' (Total

Rejection) تھا۔

۳۔ عملی جدائی: یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ ۱۹۷۸ میں پروفیسر صاحب کی دعوت پر پاکستان آنے کے باوجود، ڈاکٹر صاحب ان کی ٹاسک فورس کے ساتھ زیادہ عرصہ نہ چل سکے۔ ان کی آزاد سوچ اور 'انقلابی' نقطہ نظر، پروفیسر خورشید صاحب کے 'اصلاحی' اور سمجھوتہ پسندانہ فریم ورک میں فٹ نہیں ہو سکتا تھا۔

۴۔ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی اردو زبان و بیان کے حوالے سے عارف الحق عارف صاحب کے بیان پر میں اپنی عینی شہادت کی بنیاد پر کچھ مزید روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ کانونٹ اسکول (سینٹ پیٹرکس) کی ابتدائی تعلیم اور پھر طویل عرصہ مغرب میں قیام کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو اردو رسم الخط میں لکھنے کی باقاعدہ مشق نہ تھی۔ اگرچہ وہ اردو زبان کی گہرائی، فہم اور اس کے علمی بیان میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے، لیکن قلم اور کاغذ کے ساتھ اردو لکھنے کا تجربہ ان کے لیے ایک چیلنج تھا۔ پاکستان مستقل واپسی کے بعد جب انہوں نے اردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا، تو میں ہی ان کی ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ کر انہیں حتمی شکل (Finalize) دیا کرتا تھا۔ اس عمل کے دوران میں نے دیکھا کہ شروع شروع میں ان کی اردو تحریر میں املاء کی کافی غلطیاں ہوا کرتی تھیں، لیکن ان کے اندر سیکھنے کا مادہ اور نظریاتی اخلاص اتنا شدید تھا کہ انہوں نے مسلسل مشق جاری رکھی۔ میں اس امر کا گواہ ہوں کہ رفتہ رفتہ ان کی املاء بہتر ہوتی گئی اور آخری دور کی تحریروں میں یہ غلطیاں نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھیں۔

# عزیزانِ گرامی، برادرانِ محترم حسین انصاری اور محمد انصاری

علی محمد رضوی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کے والدِ ماجد اور اپنے استادِ محترم، مرحوم ومغفور باذن اللہ ڈاکٹر جاوید انصاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر کس طرح آپ کی خدمت میں تعزیت پیش کروں۔ جو بھی الفاظ ادا کیے جائیں، وہ اس گہرے صدمے اور عظیم نقصان کا احاطہ نہیں کرسکتے جو میں اپنے استادِ مکرم، مرشدِ معظم اور محسنِ کبیر کی رحلت پر محسوس کررہا ہوں۔

البتہ موت ایک اٹل حقیقت ہے، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے آخری مکتوبات میں سے ایک مکتوب میں مجھے یاد دلایا تھا کہ موت برحق ہے۔ حتیٰ کہ دنیا کی عظیم ترین ہستیوں کے بارے میں بھی قرآنِ مجید نے فرمایا کہ ہر ایک کو اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے، اور یہی حقیقت ڈاکٹر صاحب کی فکر کا بنیادی نکتہ تھی کہ اصل اور دائمی مقام آخرت ہے۔ اور وہ اپنی پوری زندگی اسی آخرت کی تیاری میں مصروف رہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے، انہیں اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے، اور رسولِ پاک ﷺ اور اہلِ بیتِ اطہارؑ، اور صدیق و علی رضی اللہ عنھما، جن سے انہیں بے پناہ محبت تھی، کی معیت نصیب فرمائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں حوضِ کوثر سے سیراب فرمائے اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنادے۔

یقیناً آپ کے لیے یہ ایک عظیم صدمہ ہے، کیونکہ باپ اور بیٹوں کا رشتہ نہایت مقدس اور گہرا ہوتا ہے۔ لیکن یہ نقصان میرے لیے بھی کم نہیں، کیونکہ وہ میرے روحانی والد تھے۔ انہوں نے مجھے پڑھنا سکھایا، لکھنا سکھایا، اور درحقیقت آج میں جو کچھ بھی ہوں، ان کی شفقت، محبت اور تربیت کا نتیجہ ہوں۔ میں زندگی بھر ان سے سیکھتا رہا اور آئندہ بھی ان کی تعلیمات میرے لیے مشعلِ راہ رہیں گی۔

ڈاکٹر صاحب کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ ان کا احاطہ الفاظ میں ممکن نہیں۔ میں ساری زندگی ان کا اور ان کے اہلِ خانہ کا ممنون اور خادم رہوں گا، ان شاء اللہ۔ ان کی وفات کے بعد

بھی مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنی خدمت کا موقع دیتے رہیں گے۔

آخر میں، میں آپ کی خدمت میں ایک بار پھر دلی تعزیت پیش کرتا ہوں، اور گزارش ہے کہ اپنی والدۂ ماجدہ کی خدمت میں بھی ہماری جانب سے تعزیت ضرور پہنچادیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور اس کٹھن گھڑی میں ان کا حامی و ناصر ہو۔

وہ مردِ حق تھا، کتنے صاف و سادہ تھے اصول اس کے
وہ کہتا تھا خدا ایک ہے، محمد (ﷺ) ہیں رسول اس کے
وہ کہتا تھا محمد (ﷺ) سے محبت اصلِ ایماں ہے
بنائے وحدتِ ملت ہے، پشتیبانِ ایماں ہے
نظر ڈالی نہ تھی کبھی اسباب و زینت پر
خدا رحمت کرے اس پاک باز و پاک طینت پر
عمل تھا تابعِ فرمانِ قرآنِ شریف اس کا
رہا وقفِ ریاضت عمر بھر جسمِ نحیف اس کا
وہ قائل تھا فقط اسلام ہی کی بادشاہی کا
دیا کرتا تھا درسِ اطفال کو علمِ الٰہی کا
کیا تھا خدمتِ ملت کا رستہ اختیار اس نے
اسی دامن میں بسایا گلشنِ کنجِ ہزار اس نے
مرے حبِّ رسول اللہ (ﷺ) کی بنیاد ہے مسجد
خدا آباد رکھے، آج بھی آباد ہے مسجد

والسلام

آپ کا خادم،

احقر العباد علی محمد رضوی

# نظریات و تطبیقات

# تصورِ آزادی کے تضادات

جاوید اکبر انصاری
علی محمد رضوی

آزادی اور خود مختاری (autonomy) ایک ناقابل حصول ہدف ہے۔ اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل موت ہے۔ جب ہر فرد بلا ارادہ لازماً مر جاتا ہے تو حصول آزادی کی جستجو لازماً ایک دیوانے کے خواب کے مترادف ہے۔ اس دیوانگی میں کانٹ سے لیکر ہیبرماس تک تنویری فکر (Enlightenment Thought) مبتلا رہی ہے۔ مغرب کو جاہلیت خالصہ کہنے کا یہ ایک بنیادی سبب ہے۔

لیکن اس دیوانگی سے مایوسی کے کچھ نہ کچھ اشارات مغربی فکر میں اب پائے جانے لگے ہیں جس کی اہم وجہ سائنس (جاہلی علمیاتی منہج) کا پیدا کردہ ماحولیاتی بحران ہے۔ سائنس نے تصرف فی الارض کو اس حد تک پہنچادیا ہے کہ دنیا انسانیت کے لیے ناقابل رہائش بنتی چلی رہی ہے اور کائناتی توازنات (environmental balances) درہم برہم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ قدرتی ذرائع بالخصوص تیل اور گیس ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں جن پر آزادی / سرمایہ کے فروغ کا دارومدار ہے اور ان کے متبادل تلاش کرنا ایک اور پیچیدہ ترین عمل ثابت ہو رہا ہے۔

تصور آزادی کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف تو آزادی سے مراد انسانی ارادے کا فطرت پر حاوی ہونا ہے۔ دوسری جانب آزادی کا مطلب یہ ہے کہ فرد یا گروہ کسی دوسرے فرد یا گروہ کے ارادے کا تابع نہ ہو۔ عملاً اس دوسرے تصور کا مطلب یہ ہے کہ فرد یا گروہ صرف سرمایے کا تابع ہو۔ یہ دونوں تصورات سرمایہ دارانہ عمل میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

## آزادی کی مادی تعبیر

آزادی ایک مادہ پرستانہ تصور ہے۔ آزادی کا مطلب تصرف فی الارض کے ذریعے انسانیت کی

تمام مادی ضرورتوں پر حاوی ہوتے ہوئے خوش حالی کے دور میں قدم رکھنا ہے۔ بقول مارکس "آزادی کا دور اس وقت فروغ پاتا ہے جب ضرورتوں کا دور ختم ہو جائے"[۱]۔ صنعتی ترقی سے امید کی جاتی تھی کہ وہ تمام انسانیت کو محنت کر کے اپنی ضرورتیں پورا کرنے کی "مصیبت" سے نجات دلا دے گی۔ بشرطیکہ موجودہ صنعت سرمایے کی تحویل میں ہو[۲]۔ اس تصور آزادی میں اشیا کی فراوانی (abundance) کی عدم موجودگی کو استحصالی عمل کا بنیادی محرک تصور کیا جاتا ہے۔ یعنی جب اشیا کی فراوانی لامحدود ہو جائے گی تو استحصال کی ضرورت نہ رہے گی اور آزادی کی آفاقیت قائم ہو جائے گی[۳]۔ لہٰذا اشیا کی فراوانی کی تحدید لازماً انسانیت کی اکثریت کو آزادی یعنی خود مختاری سے محروم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جیسا کہ لی فلپس (Leigh Phillips) نے لکھا ہے "آزادی کا مطلب ہی مادی ترقی ہے"[۴]۔ بہت سے مادہ پرست آئی ٹی صنعت بالخصوص خود کاریت (automation) سے امید وابستہ کیے ہوئے ہیں کہ وہ دورِ فراوانی کی وقوع پذیری کو ممکن بنا دے گی لیکن اس کا انحصار نئے ذرائع توانائی کی دریافت سے ہے۔ جیسے جیسے ماحولیاتی تحدیدات اشیا کی فراوانی کو محدود کریں گی ویسے ویسے آزادی یعنی خود مختاری کے فروغ کے امکانات کم ہوتے چلے جائیں گے۔ سیبسٹیانو ٹمپیناروSebastiano Timpanaro لکھتا ہے کہ قدرتی ذرائع اصلاً محدود ہیں اور فطرت پر انسانی اختیار محدود ہے لہٰذا لامحدود ضرورتوں کو پورا کرنا انسان کے بس میں نہیں[۵]۔ لہٰذا دورِ فراوانی کبھی نہیں آ سکتا۔ قدرت خود اپنے مادی اظہار۔ بالخصوص انسانی جسم کی صورت میں جو ضعف اور بالآخر موت کا شکار ہوتا ہے، آزادی کی تحدید کا باعث بنتی ہے۔ آزادی کا یہ مادی تصور آفاقی آزادی (Universal Freedom) کے حصول کو اصولاً ناممکن ثابت کرتا ہے۔

## آزادی اور انسانی ضروریات

تنویری فکر انسانی ضروریات کو لامحدود تصور کرتی ہے۔ اس تصور میں انسانی ضروریات ہمیشہ بڑھتی رہتی ہیں۔ بہت سے پس تنویری مفکرین ( Post Enlightenment

Thinkers) یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قدرتی وسائل کی محدودیت بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنا ناممکن بنا دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آزادی کا حصول قدرتی وسائل کی حدود کے اندر رہتے ہوئے تلاش کرنا چاہیے۔ چناچہ وہ کہتے ہیں کہ ایسے ذرائع پیداوار کو فروغ دینا چاہیے جو قدرتی تحدید سے ہم آہنگ ہیں مثلاً خود کفالتی کھیتی باڑی (subsistence farming) وغیرہ [٦]۔ اس فکر میں ٹیکنالوجی کا نقد موجود ہے جو اس کے ارتقاء کو ایک خلاف فطرت اقدام گردانتی ہے۔ اس تصور میں صرف وہ پیداواری عمل آزادی کو فروغ دینے کی اہلیت رکھتا ہے جو کارکن کی خود مختاری (autonomy) کا باعث ہو۔ اس تصور میں بنیادی اہمیت خود اختیاریت کو ہے یعنی وہ پیداواری عمل آزادی کو فروغ دے سکتے ہیں جن کی تنظیم کاری میں کارکن خود اختیار ہوں۔ خود اختیاریت کو فروغ دینے والی ٹیکنالوجی، آزادی کے فروغ کے تقاضوں کو ضرورت کی فراہمی سے ہم آہنگ کر سکتی ہے۔

یہ فکر تنویری فکر کے اس مرکزی دھارے سے ہم آہنگ نہیں جو انسانی ضرورتوں کی لامتناہی بڑھوتری کو فرض کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ضرورتوں کی دو قسمیں ہیں:

"حقیقی" ضرورتیں یعنی وہ ضرورتیں جو ان سکڑتے ہوئے پیداواری اعمال سے پوری کی جا سکتی ہیں جن میں کارکن خود کفیل ہو سکتے ہیں اور "مصنوعی" ضرورتیں جو ان پھیلتے ہوئے پیداواری اعمال سے پوری کی جاتی ہیں جن میں کارکنوں کی خود کفالت ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ ضرورتوں کی یہ تحدید سرمایہ دارانہ بڑھوتری (accumulation of capital) کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ سرمایے کی بڑھوتری کی تحدید آزادی کی تحدید کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

## آزادی اور استحصال

کچھ حالیہ تجزیے آزادی کے فروغ پر قدرتی تحدیدات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مثلاً فلپ پٹیٹ Pettit Philip کہتا ہے کہ آزادی کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک شخص پر کسی دوسرے کا تحکم (domination) مسلط نہ ہو [٧]۔ یہ نظریہ بھی بڑھوتریٔ سرمایہ کی ضرورتوں اور اس کی قدرتی وسائل پر انحصار کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کا غیر حقیقت پسندانہ

مفروضہ یہ ہے کہ تحکمیت (domination) کو فطرتی تحدیدات (ماحولیاتی ابتری، جسمانی ضعف) کے باوجود کم کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ بھی طرائق پیداوار (production technologies) کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ ٹیکنالوجیز جو تحکمیت کو مستحکم کرتی ہیں اور وہ جو تحکمیت پر انحصار نہیں کرتیں۔ آزادی کا فروغ موخر الذکر ٹیکنالوجیز کے پھیلاؤ پر ہے۔ کیا ایسا پھیلاؤ سرمایہ دارانہ بڑھوتری سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے اور کس حد تک کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ فکر نہیں دیتی۔ کیا تحکمیت کو کم کرنے والی پیداواری ٹیکنالوجیز بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کر سکیں گی۔ اس کا جواب بھی اس فکر میں نہیں ملتا۔ کچھ مصنفین مثلاً مارٹن ہیگلینڈ (Martin Hägglund) پیداواری عمل کو اسی طرح منظم کرنے کی وکالت کرتے ہیں کہ افراد کے آزاد وقت (وہ وقت جو پیداواری عمل میں صرف نہ ہو) میں اضافہ ہوتا رہے [۸] لیکن وہ بھی پیداواری نظام کی نوعیت کی تبدیلی کے ضمن میں خاموش رہتے ہیں۔ اس فکر میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ کیا سرمایہ داری کی ٹیکنالوجیکل ترقی کو معاشرتی اور مادی ترقی سے جدا کیا جا سکتا ہے اور اگر یہ ممکن ہے تو کیسے۔ عملاً اس کا قوی امکان موجود ہے کہ آزاد وقت اور غیر تحکمی ٹیکنالوجیز، بڑھوتریٔ سرمایہ کی رفتار کو سست کر دیں گے اور یہ آزادی کی تحدید کا دوسرا نام ہے۔

## آزادی کی نیم مادی تعریف

یہ نظریہ آزادی پر قدرتی تحدیدات کے تناظر میں آزادی کا ایک نیم مادی تصور پیش کرتا ہے۔ اس نظریہ کو ابہامی نظریہ (ambiguous) بھی کہا گیا ہے۔ اس نظریے کی پہلی خالق مشہور فرنچ فلسفی سارتر کی داشتہ اور رکھیل سیمون ڈی بووار (Simone de Beauvoir) تھی [۹]۔ اس کے مطابق آزادی یہ ہے کہ فرد قدرتی اور معاشرتی تحدیدات کو قبول کرتے ہوئے اپنا لائحۂ عمل خود متعین کرے۔ اس نظریے کے مطابق ہر شخصی آزاد ماحول اور معاشرہ پروان بھی چڑھاتا ہے اور اس آزادی کی حد بندی بھی کرتا ہے۔ یہ ابہامی آزادی انسانی (ہیومن) وجود کی بنیادی ابہامیت (ambiguity) کا ایک پہلو

ہے۔ فرد بیک وقت فاعل بھی ہے اور مفعول بھی۔ وہ ریشنل بھی ہے اور حساس (sensuous) بھی۔ وہ کائنات اور معاشرے کے تابع بھی ہے اور ان سے جداگانہ حیثیت بھی رکھتا ہے۔ افراد کو اپنی وجودی ابہامیت کو قبول کرتے ہوئے اپنے محدود اختیارات کے استعمال کی استطاعت کو فروغ دینا چاہیے۔ یہی آزادی ہے۔

آزادی کا مطلب یہ ہے کہ فرد مادی وسائل کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے یہ حقیقت مد نظر رکھتے ہوئے استعمال کرے کہ یہ وسائل لامحدود نہیں۔ یہ ابہامی آزادی کی مادی بنیاد ہے۔ ہم قدرت کو اس کی مادی قوتوں کے استعمال کے ذریعے ہی پہچانتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا، مادی وسائل آزادی کے فروغ کے ذرائع بھی فراہم کرتے ہیں اور ان کی حد بندی بھی کرتے ہیں۔ آزادی اور تحدیدات کی اس آمیزش کو مجرد / کلی طور پر متصور نہیں کیا جا سکتا (یہی ابہامیت ہے) بلکہ صرف ان مقاصد کے ضمن میں باور کیا جا سکتا ہے جو فرد اپنائے ہوئے ہے۔ یہی ابہامیت فرد کے معاشرتی دائرۂ کار کو بھی متعین کرتی ہے۔ جو معاشرہ تاریخی طور پر ابھرا ہے وہ فرد کی آزادی کے فروغ اور تحدید دونوں کو متعین کرتا ہے اور تعین کے اس توازن کو صرف انفرادی مقاصد کے حصول کے سیاق ہی میں سمجھا جا سکتا ہے (اس عمل کو مجرد اعن سیاق یا کلی / اجمالی طور پر نہیں سمجھا جا سکتا ہے)۔

اس نظریے کے مطابق آزادی اور ضروریات ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور ضروریات کی محدود تسکین ہی آزادی کو فروغ دیتی ہے۔ ابہامی آزادی کا مطلب ارادی فیصلہ سازی کو مادی اور سماجی حد بندیوں کے دائرہ میں فروغ دینا ہے۔ ان بندشوں میں بدنی زوال بھی شامل ہے جو ریشنلٹی کی استطاعت کو متاثر کرتا ہے اور احساسات کو بھی۔ ہیومنٹی کو کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ وہ ٹیکنالوجیکل تبدیلیوں اور معاشرتی ارادہ سازی کے ذریعے مادی اور سماجی بندشوں کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی آزاد فیصلہ سازی کو فروغ دے۔ آزاد فیصلہ سازی ان معنوں میں ابہامی ہے کہ ایک فرد کے فیصلے دوسرے فرد کے فیصلوں سے متصادم بھی ہو سکتے ہیں اور فیصلوں کے اس تضاد کو رفع کرنے کے لیے کوئی اقداری پیمانہ موجود نہیں۔ کسی

قدر مطلق کی تلاش فیصلہ سازی کی (مبہم) آزادی کو ختم کر دیتی ہے۔ ہیومنٹی کے دائرۂ اختیار کی مادی اور سماجی تحدیدات کو رفع نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو قبول کر کے ان کے دائرے میں ابہامی آزادی کو تلاش کرنا چاہیے۔

## خلاصہ

یہ تمام نظریات کفار اور ملحدین کے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی آخرت اور زندگی بعد موت پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ سب آزادی / سرمایہ کی بڑھوتری کو قدر مطلق گردانتے ہیں۔ یہ بات ان وجودی مفکرین کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جو کسی بھی قدر مطلق کے وجود کا انکار کرتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں ہیومنٹی کی فیصلہ سازی کی استطاعت کو فروغ دینا ہی قدر مطلق ہے اور یہ سرمایہ دارانہ نظام کو قبول کرنے پہ منحصر ہے۔ یہ فیصلہ سازی بڑھوتریٔ سرمایہ کے تناظر میں ہی کی جا سکتی ہے۔

آزادی کو قدر مطلق کے طور پر قبول کرنے کے باوجود یہ تمام مکاتب فکر حصول آزادی کی جستجو پر بڑھتی ہوئی تحدیدات کا اقرار کرتے ہیں۔ مارکسی اور ماحولیاتی تجزیہ کار موسمی اور کائناتی تقاضوں کی مجبوری کے تحت آزادی کو محدود کرنا چاہتے ہیں۔ عمرانی تجزیہ کار نظم پیداوار میں تبدیلیوں کے ذریعے مادی حدود میں رہتے ہوئے آزادی کی جستجو کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔

وجودی مفکرین کہتے ہیں کہ آزادی صرف انفرادی فیصلوں کے ضمن میں معنی رکھتی ہے۔ اس کا کوئی کلی یا نظاماتی وجود نہیں۔ وہ بھی مادی اور سماجی تحدیدات کے تناظر میں آزادی کی جستجو کو جاری رکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ لیکن آزادی کے ان تضادات اور تحدیدات کو سمجھنا آزادی کو سرمایے کی فریب کاری کے طور پر دیکھنے کی جانب پہلا قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

## بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

حقیقت یہ ہے کہ سرمایے کے تعقل (ریشنلٹی) کے غلبے کے دور میں آزادی ایک لغو اور بے

معنی تصور ہے۔ جو شخص بھی سرمایہ دارانہ تعقل (ریشنلٹی) کو قبول کر لیتا ہے وہ لامحالہ اپنی فیصلہ سازی کی استطاعت سرمایہ کے سپرد کر دیتا ہے اور سرمایہ کا غلام بن جاتا ہے۔ اس کے تمام فیصلے بڑھوتریٔ سرمایہ کی جستجو میں مقید رہتے ہیں۔ سرمایے کا نظاماتی تسلط اس کو کسی اور عمل کی اجازت شاذ و نادر ہی دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان عبد ہے، آزاد نہیں ہے۔ جب اس کے فیصلے مرضیِ رب کے مطابق ہوتے ہیں تو وہ سرخرو ہوتا ہے اور جب وہ رب کے فیصلوں سے بغاوت کرتا ہے تو وہ نامراد ہوتا ہے۔

## نوٹس اور حوالہ جات

[۱] کارل مارکس کے جس قول کا متن میں حوالہ دیا گیا ہے، وہ مارکس کی مشہورِ زمانہ کتاب داس کیپٹل (Das Kapital) کی تیسری جلد (Volume III) کے باب نمبر ۴۸ سے ماخوذ ہے۔ مارکس کے اصل الفاظ (انگریزی ترجمے میں) کچھ یوں ہیں:

"The realm of freedom actually begins only where labour which is determined by necessity and mundane considerations ceases".

مارکس کا استدلال یہ ہے کہ انسانی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے:

۱۔ ضرورت کا دائرہ: یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انسان کو اپنی بقا (کھانے، پینے اور رہنے) کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ مارکس کے نزدیک جب تک انسان فطرت کے جبر کے تحت محنت کر رہا ہے، وہ "آزاد" نہیں ہے۔

۲۔ آزادی کا دائرہ: یہ دائرہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب پیداواری قوتیں (Productive Forces) اتنی ترقی کر جائیں کہ انسان کی تمام مادی ضرورتیں کم سے کم وقت میں پوری ہو جائیں۔ اس سے جو وقت بچے گا، اسے مارکس "فرصت" (Leisure) کہتا ہے، جہاں انسان اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھار سکے گا۔ یہی وہ مقام ہے جسے متن میں "دورِ فراوانی" (Era of Abundance) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[۲] اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے مفکرین (بشمول کارل مارکس) کا یہ خیال تھا کہ ٹیکنالوجی اور مشین

اس قدر ترقی کر جائے گی کہ انسان کو بقا کے لیے کی جانے والی "جسمانی مشقت" سے نجات مل جائے گی۔ مارکس نے اسے "ضرورت کی قلمرو" (Realm of Necessity) سے "آزادی کی قلمرو" (Realm of Freedom) کی طرف منتقلی کا نام دیا تھا۔ "بشرطیکہ سرمایے کی تحویل میں ہو" نجی اور ریاستی سرمایہ داری کی دوئی کی کم نظری کی طرف اشارہ ہے اور مارکسی و غیر مارکسی سرمایہ داری کی مشترکہ بنیادوں کو واضح کرتا ہے۔ آزادی کا حصول بڑھوتری سرمایہ پر منحصر ہے اور بڑھوتری سرمایہ سرمایے کی منطق کے تتبع پر منحصر ہے۔ اس استدلال کی تہیں کچھ یوں ہیں:

۱۔ نجی بمقابلہ ریاستی سرمایہ داری کا سراب: عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر ذرائع پیداوار ریاست کی تحویل میں ہوں (جیسا کہ سوویت یونین میں تھا)، تو وہ سرمایہ داری نہیں ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔

۲۔ مشترکہ بنیاد: چاہے مالک ایک فرد ہو (نجی) یا پوری ریاست (اشتراکی)، اگر پیداواری عمل کا مقصد سرمایے کی بڑھوتری (Accumulation) ہے، تو وہ سرمایہ داری ہی ہے۔

سرمایہ بحیثیتِ مقتدر: ریاست جب سرمایہ کار بنتی ہے، تو وہ خود سرمایے کی منطق (Efficiency, Growth, Profit) کی غلام بن جاتی ہے۔ اس لیے مارکسزم اور لبرلزم، دونوں کی جڑیں ایک ہی مادی زمین میں پیوست ہیں۔

۳۔ آزادی کا بڑھوتریِ سرمایہ پر انحصار: جدید انسان کے لیے آزادی کا مطلب ہے زیادہ سے زیادہ اشیاء اور سہولیات تک رسائی۔ یہ رسائی صرف تب ممکن ہے جب معیشت ترقی کرے (Economic Growth)۔ معاشی ترقی کا ایندھن سرمایے کی بڑھوتری ہے۔ یوں، جدید آزادی دراصل سرمایے کی مرہونِ منت بن جاتی ہے۔ اگر سرمایہ نہیں بڑھے گا، تو آپ کی آزادی (مثلاً صرف کرنے کی قوت) ختم ہوتی چلی جائے گی۔

۴۔ سرمایے کی منطق کا تتبع: یہاں سب سے اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ سرمایہ محض رقم نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا خود مختار نظام تعقل (ریشنلٹی) ہے جو اپنی بڑھوتری کے لیے انسانی ارادے کو استعمال کرتا ہے۔ جو شخص یا معاشرہ اس منطق کو قبول کر لیتا ہے، وہ مجبور ہے کہ اپنے تمام فیصلے (تعلیم، خاندان، ریاست، اخلاق) اسی بنیاد پر کرے جو سرمایے کی افزائش میں مددگار ہوں۔ یہی سرمایہ داری ہے۔ یہی آزادی ہے۔

[۳]۔ مارکس کے نزدیک تمام استحصال اور نتیجتاً طبقاتی کشمکش کی بنیاد وسائل کی کمیابی (scarcity) ہے۔ جب وسائل کی کمیابی سے اوپر اٹھا جا سکے گا اور فراوانی کا دور ہو گا تو استحصال ختم ہو جائے گا اور نتیجتاً طبقاتی

کشمکش بھی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت نہ ریاست کی ضرورت رہے گی اور نہ جبر کی ضرورت رہے گی۔ حقیقتاً دنیا میں جنت قائم ہو جائے گی۔ اس مرحلے کو وہ کمیونزم کہتا ہے۔ مارکس کے نزدیک جب تک انسان زندہ رہنے کے لیے (روٹی، کپڑا، مکان) کام کر رہا ہے، وہ آزاد نہیں بلکہ "مجبور" ہے۔ آزادی تب شروع ہوتی ہے جب مشینیں سب کام کر دیں اور انسان کے پاس صرف اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا "فارغ وقت" (Leisure) ہو۔ مارکس کے نزدیک اشیاء کی فراوانی (Abundance) وہ لازمی سیڑھی ہے جس کے بغیر آزادی کے اس مرحلے تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

[۴]۔ متن میں فلپس کی طرف منسوب اقتباس دراصل اس کی کتاب

*Austerity Ecology and the Collapse-Porn Addicts: A Defence of Growth, Progress, Industry And Stuff*

کے مرکزی فلسفے کی طرف اشارہ ہے۔ فلپس کے اس نظریے کے تحت انسان تب تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک وہ قدرت کا محتاج ہے۔ اس کے نزدیک آزادی کا پیمانہ "اختیارات کی وسعت" ہے اور یہ وسعت صرف ٹیکنالوجی اور مادی وسائل کی کثرت سے آتی ہے۔ اگر آپ کے پاس سفر کے لیے طیارہ، بیماری کے لیے جینیاتی علاج اور بھوک مٹانے کے لیے مصنوعی گوشت ہے، تو آپ "آزاد" ہیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ مادی ترقی (Material Progress) اور آزادی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ مزید پڑھیں اس کا مضمون:

The degrowth delusion. https://www.opendemocracy.net/en/oureconomy/degrowth-delusion/

[۵]۔ متن میں جو حوالہ دیا گیا ہے، وہ ٹمپینارو کی کتاب *On Materialism* (اشاعت: ۱۹۷۰/۱۹۷۵) سے ماخوذ ہے۔ ٹمپینارو کا یہ اقتباس دراصل اس کے اس فلسفے کی بنیاد ہے جسے وہ Materialist Pessimism (مادہ پرستانہ قنوطیت) کہتا ہے۔ ٹمپینارو اپنی کتاب کے باب "Considerations on Materialism" میں جو لکھتا ہے اس کا متن کے حوالے کے سیاق میں خلاصہ یہ ہے:

"We cannot overcome the fact that nature is not only a source of resources but also a source of limits... The biological frailty of the human body, the certainty of

old age and death, are the ultimate boundaries that no social revolution or technological abundance can dissolve".

[۶]۔ یہاں خود کفالتی کھیتی باڑی (Subsistence Farming) اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی بات کی گئی ہے جو زمین کو بنجر کیے بغیر انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔ ان مفکرین کے نزدیک ٹیکنالوجی کا مقصد فطرت کو "فتح" کرنا نہیں بلکہ فطرت کے ساتھ "تعاون" کرنا ہونا چاہیے۔ یہ غالباً E.F. Schumacher (مصنفِ Small is Beautiful) یا Ivan Illich جیسے مفکرین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے "Convivial Tools" اور ایسی ٹیکنالوجی کی وکالت کی جو انسانی کے اندر ہو۔

[۷]۔ فلپ پیٹٹ اپنی کتاب *Republicanism: A Theory of Freedom and Government* میں آزادی کی تعریف "Non-domination" (عدمِ تسلط) کے طور پر کرتا ہے۔

[۸]۔ ہیگلینڈ اپنی کتاب This Life میں کہتا ہے کہ آزادی کا معیار "آزاد وقت" (Free Time) ہے، یعنی وہ وقت جو ہم بقا کی تگ و دو سے ہٹ کر گزاریں۔

[۹]۔ بووار کا فلسفہ، اس کی کتاب *The Ethics of Ambiguity* میں تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کی کتاب کا ایک مرکزی نکتہ یہ ہے کہ انسان کا وجود متضاد ہے۔ ایک طرف وہ "آزاد ارادہ" رکھتا ہے اور دوسری طرف وہ "مادی گوشت پوست" اور "معاشرتی جبر" کا قیدی ہے۔ بووار کے نزدیک انسان "آزاد پیدا نہیں ہوتا بلکہ آزاد بنتا ہے"۔ اس کے لیے آزادی کوئی ایسی شے نہیں جو ہمیں مل گئی ہے، بلکہ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ بووار کے نزدیک آزادی یہ نہیں کہ آپ ہر قید سے نکل جائیں، بلکہ یہ ہے کہ آپ اپنی قید (قدرتی و معاشرتی تحدیدات) کو پہچان کر ان کے اندر اپنا راستہ خود بنائیں۔

# کانٹ کا فلسفہ اور ہیومنزم کی نظریاتی بنیادیں

علی محمد رضوی

بیاد سیدی و مرشدی ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری رحمۃ اللہ علیہ

نقطۂ پرکار حق، مرد خدا کا یقین

اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

کانٹ (Immanuel Kant) کا فلسفہ ہیومنزم (Humanism) کی جدید شکل کے لیے ایک بنیادی چٹان کی حیثیت رکھتا ہے، خاص طور پر اس لحاظ سے کہ وہ خود مختاریت (Autonomy) اور ریزن (Reason) کو اخلاقی، کونی اور وجودی مرکزیت دیتا ہے۔ کانٹ نے اخلاقیات کو خدا کے احکام سے آزاد کر کے انسان کے ریزن پر مرکوز کیا۔ اس کے مطابق، اخلاقی عمل کا سرچشمہ کسی بیرونی حکم (Heteronomy) کی اطاعت نہیں، بلکہ انسان کی اپنے ریزن کا خود کو دیا گیا اخلاقی قانون (Categorical Imperative) ہے۔

کانٹ کا مشہور اصول ہے کہ انسان کو ہمیشہ مقصد (End) سمجھا جانا چاہیے، نہ کہ محض ذریعہ (Means)۔ یہ نظریہ انسان کی مطلق قدر (Absolute Worth) کی تصدیق کرتا ہے، جو ہیومنزم کی روح ہے۔ یہ واضح طور پر عبودیت اور اطاعت پر مبنی اخلاقیات کے خلاف ایک بغاوت ہے۔

اس مضمون میں کانٹ نے فلسفۂ اخلاق میں جو انقلاب برپا کیا اس کی فلسفیانہ بنیادوں کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مضمون کے آخر میں ہم کانٹ کے خیالات کا اسلامی انقلابی نقطۂ نظر سے نقد مرتب کرنے کے لیے ایک ابتدائی خاکہ بھی پیش کریں گے۔

## مغرب کی خدا کے خلاف بغاوت

مغرب کی خدا کے خلاف اس تازہ بغاوت کا آغاز لوتھر سے ہوا۔ لوتھر کی تحریک قرون وسطی

کی عیسائی تہذیب کے خلاف پہلی بغاوت نہ تھی لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کلیسا کے خلاف سب سے کامیاب اور سب سے اہم بغاوت تھی [۱]۔ لوتھر اور کالون کی تحریکوں اور پروٹیسٹنزم نے ہیومنزم کو مذہبی جواز فراہم کیا اور اسکے عمومی غلبے کے لیے راہ ہموار کی۔ پروٹسٹنٹزم نے مغرب کی خدا کے خلاف بغاوت اور سرمایہ دارانہ "تہذیب" کا ایک اہم ترین جواز پیش کیا اور مغربی اور شمال مغربی یورپ کے معاشروں کو سیکولرائز کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

سیکولرائزیشن کا مطلب یہاں یہ ہے کہ فرد، معاشرے اور ریاست پر جو چیز حاوی ہو گئی وہ دنیا پرستی اور دنیا میں فلاح و نجات تھے اور آخرت میں فلاح و نجات کا تصور یا تو محو ہو گیا یا یہ سوال دنیاوی فلاح و نجات کے کسی نہ کسی طرح تابع ہو گیا۔

ا۔ انفرادی اور علمی سطح پر آزادی کے تصور نے عبادت کی جگہ لے لی اور آزادی کو نئی انفرادیت کی بنیاد بنایا گیا۔ لوتھر نے فرد کو براہ راست خدا سے منسلک کرنے کا دعویٰ کیا ("Priesthood of all believers")۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ ہر انسان خدا سے براہ راست رشتہ استوار کرنے میں آزاد ہے اور کتاب مقدس کی انفرادی تشریح و تعبیر کا اہل ہے۔ اس نظریے نے عیسائی علمی روایات کی گرفت کو کمزور کیا اور نئی علمی روایات کی داغ بیل ڈالی گئی جو خالص صفر سے شروع ہونے کا ادعا کرتی تھیں اور علمی عمارت کو نئی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا زعم رکھتی تھیں۔ اس کی تفصیل ڈیکارٹ کے منہاج میں ملتی ہے۔ اس لحاظ سے لوتھر کے کام اور ڈیکاٹ کے کام کو متوازی اور آپس میں ایک دوسرے کو قوی کرنے والا کہا جا سکتا ہے [۲]۔

۲۔ معاشرتی سطح پر نظام اطاعت و رشد و ہدایت کی بیخ کنی کی بنیادیں رکھی گئیں۔ انسان کا رشتہ خدا سے آزادی کی بنیاد پر استوار کیا گیا اور عبودیت کو یا تو رد کر دیا گیا یا اس کی تشریح آزادی کی نئی لغت میں کی گئی۔ معاشرتی صف بندی کی بنیاد بھی آزادی قرار پائی اور پرانے نظام اطاعت و رشد و ہدایت کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا۔ پرانے معاشروں کی بنیاد نظام رشد و

ہدایت تھی جس میں خدا یا موروثی روایات کی اطاعت مختلف معاشرتی اطاعتوں کے سلسلے میں منسلک و پیوست تھی۔ مثال کے طور پر، اسلامی نظام اطاعت و رشد و ہدایت ایک سلسلۂ مراتب (hierarchy) بناتا ہے۔ قرون وسطی کی عیسائی معاشرت بھی ایک نظام اطاعتِ رشد و ہدایت میں پیوست و منسلک تھی (یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ وہ نظام رشد و ہدایت حقیقت میں گمراہیوں سے پر تھا)۔ اس نظام اطاعت کی شکست و ریخت لوتھر کی تحریک کا ایک اہم ابتدائی نتیجہ تھا۔

۳۔ لوتھر کی تحریک نے خصوصاً اور پروٹیسٹنزم نے عموماً قوم پرستی کا جواز فراہم کیا جس کے نتیجے میں طاقتور قوم پرستانہ ریاستیں وجود میں آئیں جن کی مطلق اطاعت کا نظریہ لوتھر اور پروٹیسٹنزم نے فراہم کیا۔ دنیا پرستی کے عمومی جواز کے نتیجے میں ان ریاستوں پر سرمایہ دار اور دنیا پرست لوگ غالب ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ بربریت، سرمایہ دارانہ سامراج، سرمایہ دارانہ قوم پرست ریاستوں اور ان پر مشتمل عالمی نظام کو ایک عدم نظیر مہمیز ملی۔

لوتھر کی تحریک نے قرونِ وسطیٰ کے عالمگیری کیتھولک نظام کو توڑ کر قومی ریاستوں (Nation-States) کے عروج کے لیے زمین ہموار کی، جس کے اہم پہلو درج ذیل ہیں:

زبان اور ثقافت کی مرکزیت: لوتھر نے بائبل کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا، جس نے مقامی لسانی شناخت کو مضبوط کیا اور ایک مشترکہ جرمن ثقافتی شعور کو فروغ دیا۔ اس سے علاقائی حکمرانوں کو یہ جواز ملا کہ وہ رومن کیتھولک چرچ کے بین عالمگیر اختیار سے آزاد ہو کر قومی مفادات کی پیروی کریں۔ یہ کہا گیا ہے کہ لوتھر کی تحریک دراصل علاقائی قوم پرستی اور علاقائی بادشاہوں کا آلۂ کار تھی اور مذہبی جنگوں کا مقصد عالمگیر کلیسا کا تسلط پہلے کمزور کرنا اور بالآخر ختم کرنا تھا۔

علاقائی کلیساء (Territorial Church): لوتھر نے چرچ کے امور کو سیکولر حکمرانوں (Princes) کے کنٹرول میں دے دیا، جس نے ریاست کو نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی طاقت

بھی فراہم کر دی، اور قومی ریاست کے تصور کو مضبوط کیا۔

طاقتور ریاست کا نظریہ: لوتھر نے دو بادشاہتوں کا نظریہ (Doctrine of the Two Kingdoms) پیش کیا، جس کے تحت دنیاوی حکومت (Secular Government) کو خدا کی طرف سے عطا کردہ ایک ایسا ادارہ قرار دیا گیا جو امن و امان کو یقینی بناتا ہے۔ لوتھر کے نزدیک، عیسائیوں کو سیکولر حکمران کی مطلق اطاعت کرنی چاہیے (بشرطیکہ وہ ایمان سے متعلق احکام نہ دے)، یہاں تک کہ اگر وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ آگیسٹینی سیکولرزم کی ایک تازہ تشریح تھی۔ جان کالون نے بھی ریاست کی اہمیت پر زور دیا کہ وہ مذہبی نظم وضبط (Moral Order) قائم کرے۔

ان نظریات نے یورپ میں طاقتور، مرکزی اور مطلق العنان قومی ریاستوں (Absolute Monarchies) کے وجود کو مذہبی جواز فراہم کیا، جس سے ریاست کی غیر مشروط اطاعت کا تصور مستحکم ہوا۔ جب ریاست کو مطلق اطاعت کا حق مل گیا اور اس کی توجہ دنیاوی فلاح و بہبود (Secular Welfare) پر مرکوز ہو گئی، تو اس پر سرمایہ دار اور دنیا پرست طبقات کا غلبہ طبعی تھا۔

سرمایہ دارانہ ذہنیت (Capitalist Ethic): جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، پروٹسٹنٹ اخلاقیات نے دنیاوی محنت، دولت کے ارتکاز، اور نظم و ضبط کو ایک مذہبی فضیلت بنا دیا (ویبر کا مقالہ)۔ اس نے دولت مندوں کو معاشرتی اور ریاستی امور میں طاقتور بننے کا جواز فراہم کیا۔ طاقتور قومی ریاستیں، جو سرمایہ دارانہ اخلاقیات اور دنیاوی ترقی سے متاثر تھیں، جلد ہی عالمی وسائل پر قبضہ کرنے اور مارکیٹوں کو کنٹرول کرنے کے لیے متحرک ہو گئیں۔

سامراج (Imperialism) اور عالمی نظام: اس نے نہ صرف مطلق اطاعت کو فروغ دیا بلکہ سرمایہ دارانہ بربریت، استحصال، اور سامراجی توسیعی پالیسیوں کو بھی فروغ دیا، جس سے ایک ایسا عالمی نظام (Global System) وجود میں آیا جو معاشی جبر اور تسلط پر قائم تھا۔ یہ نظام آج بھی بڑی حد تک ان قوم پرستانہ اور سرمایہ دارانہ بنیادوں پر کھڑا ہے۔

## اخلاقیات و نظام اطاعت و رشد و ہدایت

قرون وسطی کی عیسائی تہذیب میں اخلاقیات کی بنیاد عیسائی نظام اطاعت و رشد و ہدایت اور عیسائی علمیات تھی۔

فلسفہ و تاریخ اخلاقیات میں عموماً دو قسم کے نظریے موجود رہے ہیں:

ایک نظریہ جو قدیم یونان کے زمانے سے چلا آیا ہے یہ تھا کہ اخلاقیات کی بنیاد ارادے (will) پر ہوتی ہے۔ اسے ارادتی اخلاقیات (Voluntarism) کہتے ہیں۔ قدیم یونان میں سقراط اور افلاطون کے مقابلے میں ایسے فلسفی تھے جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ انسان تمام اخلاقیات کا معیار ہے۔ عیسائیت میں اخلاقیات کی بنیاد عیسائیوں کے ایک گروہ (مثلاً آگسٹین کے پیروکاروں) کے مطابق خدا کا ارادہ ہے۔

دوسرا نظریہ یہ تھا کہ اخلاقیات کی بنیاد ارادہ نہیں ہے بلکہ اخلاقیات کا ارادے سے الگ ایک دائرۂ کار ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس دائرۂ کار میں اخلاقی حقائق موجود ہیں جن کو عقل کی بنیاد پر جانا جا سکتا ہے۔ اسے اخلاقی واقعیت (Moral Realism) کہا جا سکتا ہے۔ بہت سے عیسائی مفکرین خاص طور پر اکویناس نے اس نظریے کو اپنایا۔ مسلمانوں کے ہاں معتزلہ میں کئی علماء نے اس نظریے کی ترویج کی۔ اس نظریے کے حامی یہ کہتے تھے کہ انسان اور خدا دونوں اخلاقی حقائق کے تابع ہیں اور اخلاقی حقائق خدا اور انسان کے درمیان اشتراک کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کانٹ نے خدا اور انسان کے درمیان اشتراک کے اس نظریے کو اپنے فلسفے میں منطقی انجام تک پہنچایا۔ اس نظریۂ اخلاق کے داعی خدا کے ماننے والے بھی تھے اور خدا کو نہ ماننے والے بھی تھے، عیسائی بھی تھے غیر عیسائی بھی تھے لیکن یہ نظریہ عیسائیت اور اسلام میں سقراط اور افلاطون کے فلسفوں کے ذریعے ہی آیا ہے۔

ان دونوں طریقوں میں اطاعت ایک اہم عامل ہے اخلاقیات کو یا تو خدا کے ارادے کے تابع کیا گیا ہے یا اخلاقیات کو ایک ماورائی حقیقت مانا گیا ہے۔ لیکن دونوں عیسائی نظریات میں اخلاقیات کے بنیاد ہمیشہ انسان سے بالا حقیقت کی اطاعت کو ہی قرار دیا گیا تھا[۳]۔ امریکی

فلسفی جیروم شنیونڈ لکھتا ہے کہ ارادتی و غیر ارادتی اخلاقیات کے پیروکار دونوں اس بات پر متفق تھے کہ خدا کا وجود اخلاقیات کے لیے لازم ہے اور اس کا انکار دہریت کو مستلزم ہے (ص۔ ۵۱۰)۔ اس لیے ان مفکرین کے لیے بھی جو اخلاقیات کو خدا کے ارادے سے جوڑنے کے انکاری تھے یہ ثابت کرنا لازمی تھا کہ کہ اگر خدا اخلاقیات کا خالق نہیں تو پھر وہ اخلاقیات کے لیے کیسے ناگزیر ہے (ظاہر ہے کہ خدا کے وجود کے انکاری فلسفیوں کو یہ مخمصہ درپیش نہیں تھا)۔

مغرب میں اس اطاعتی اخلاقیات کے خلاف بغاوت خدا کے خلاف بغاوت کا ایک اہم حصہ تھی۔ اس اطاعتی اخلاقیات کے خلاف بغاوت میں اس نظریے کی مذہبی اور غیر مذہبی دونوں شکلیں شامل تھیں۔ کانٹ نے اس سلسلے میں سب سے اچھوتا اور سب سے دیرپا فلسفیانہ نظریہ پیش کیا۔ اس مضمون کا مقصد کانٹ کے خیالات کی وضاحت کرنا ہے اور اس کے ذریعے ہیومنزم کے بنیادی مقصد کو اور اس کی فلسفیانہ بنیادوں کو سمجھنا ہے۔

خود مختاری، خود ارادیت اور حکم ذاتی کے تصورات کا نشو نما پانا اطاعتی اخلاقیات کو رد کرنے کے عمل کا فطری تقاضا تھا۔ کانٹ خود مختاریت، حکم ذاتی اور آزادی کا داعی ہے لیکن ان میں سے کوئی تصور بھی اس کی ایجاد نہیں تھا۔ جدید فلسفے میں کانٹ سے پہلے کئی فلسفیوں نے حکم ذاتی (self-governance) کی اہمیت پر زور دیا اور اس کی بنیاد پر ایک اخلاقی نظام کو کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح دوسرے دھارے کے بھی کئی فلسفی تھے جنہوں نے ماورائی اخلاقیات کی ایسی شکلیں پیش کرنے کی کوشش کیں جو اطاعتی اخلاقیات کو رد کرتی تھیں اور اس کی جگہ غیر اطاعتی اخلاقیات کی ایک شکل کو پیش کرتی تھیں۔ کانٹ نے ان دونوں دھاروں سے استفادہ کیا۔ اس نے جو نیا تصورِ اخلاقیات پیش کیا وہ عیسائیت اور تاریخ فلسفے کے دونوں دھاروں کے ائتلاف پر مبنی تھا لیکن اسکا حاصل بالکل نیا تھا اور اس کی بنیاد پر اس نے ہیومنزم کی ایک دیرپا تعبیر پیش کی جو لبرلزم (انفرادیت پرستی) اور کمیونیٹیرینزم (اجتماعیت پرستی) دونوں کی مشترکہ میراث ہے۔

## اطاعتی اخلاقیات کے خلاف کانٹ کا سفر

جیسا کہ اوپر کہا گیا روایتی عیسائیت کے خلاف مذہبی اور غیر مذہبی بغاوتوں کے نتیجے میں کانٹ سے پہلے حکم ذاتی اور اس کی بنیاد پر اخلاقیات کی بنیاد رکھنے کا خیال جڑیں پکڑ رہا تھا۔ اس تحریک کی بنیاد انسان پرستی ہی تھی۔ دعویٰ یہ کیا گیا کہ روایتی عیسائی معاشرت اور اخلاقیات انسان کی قدر و قیمت و منزلت کا کماحقہ اعتراف نہیں کرتیں۔ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ روایتی (قرون وسطائی) نظامِ اخلاقیات (حقیقی) عیسائیت کے اخلاقی نظام سے ہم آہنگ نہیں تھا کیونکہ عیسائیت تمام انسانوں کو خدا کی اولاد قرار دیتی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت کا یہ تقاضا ہے کہ ہر انسان خدا کے سامنے یکساں طور پر آزاد ہو اور اخلاقیات کو اس بات کا ادراک ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ بہت سے فلسفیوں نے (جن میں سے اکثر عیسائیت کے ماننے والے تھے) یہ دعویٰ کیا کہ اخلاقیات کی بنیاد خدا کے ارادے پر نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اگر ہم یہ مان لیں کہ اخلاقیات اپنے ارادے کو خدا کے ارادے کے تابع کرنے کا نام ہے تو اس کے نتیجے میں ہم انسانی غلامی و ذلت کو فروغ دیں گے جو انسان کی کرامت ذاتی کی ہتک ہے۔ یہ دعویٰ کیا کہ اطاعت رب انسان کی توہین ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر اخلاقیات کو خدا کی تخلیق قرار دیا جائے تو خدا سے محبت کرنا ناممکن ہے۔ خدا کی ذات کی اطاعت صرف اس بنیاد پہ ہو سکتی ہے کہ وہ سچائی ہے یا حق ہے یعنی خدا سے بالا بھی کوئی حق ہے جس کے تابع انسان اور خدا دونوں ہیں۔ یہ اعتزالی خیال ان ساری تحریکوں میں موجود ہے گو کہ کانٹ نے جیسا کہ ہم دیکھیں گے اس کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا۔

کانٹ آزادی اور حکم ذاتی کا پر زور وکیل ہے۔ وہ اطاعتی اخلاقیات کو بلکہ اپنے ارادے کے علاوہ کسی دوسرے ارادے کے سامنے سرنگوں ہونے کو انسانیت کی توہین سمجھتا ہے چاہے وہ ارادہ رب العزت کا ارادہ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ بحیثیت انسان ہمیں صرف اپنے ارادے کے تابع ہونا چاہیے۔ اپنے کئی معاصرین کے برعکس کانٹ اخلاقیات کا تعلق ارادے سے نہیں کاٹتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ ارادہ ارادۂ عمومی ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ میرا ارادہ

اخلاقیات کی بنیاد ہے لیکن صرف میرا وہ ارادہ جو ارادۂ عمومی بن سکے۔ کانٹ کے الفاظ میں میرا ارادہ ارادۂ عمومی تب ہی ہو گا جب میں یہ چاہ سکوں کہ میرا ارادہ آفاقی قانون بن جائے۔ آفاقیت اور عمومیت عقل کے معیارات ہیں اور کانٹ یہاں غیر ارادتی ( non voluntarist)اخلاقیات کے حامیوں کے خیالات کی توثیق کرتا ہے لیکن وہ ارادتی اخلاقیات (voluntarism) کے حامیوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتا ہے کہ عمومیت اور آفاقیت اخلاقیات کی ضروری لیکن ناکافی شرائط ہیں۔ اخلاقیات کی ضروری اور کافی شرائط کے لیے آفاقیت اور عمومیت کو ارادے سے جوڑنا لازمی ہے۔ اس طرح اخلاقیات کی بنیاد ارادۂ عمومی (general will) قرار پاتی ہے[۴]۔ لیکن اخلاقیات کی اس کہانی کا ایک اہم حصہ ابھی باقی ہے۔ میرا ارادۂ عمومی اخلاقیات کی تخلیق کرتا ہے۔ لیکن میں با اخلاق اسی وقت ہوں گا جب میں اس ارادے پر اس نظر سے سر خم کروں کہ وہ میرا ارادہ ہے۔ ان معنوں میں اخلاقیات حکم ذاتی اور خود مختاری ہے۔ کانٹ سے پہلے مغربی فلسفہ میں کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اخلاقیات ان معنوں میں اطاعت خودی کا دوسرا نام ہے۔ اس تصور کے دو اہم پہلو ہیں:

اول، اخلاقیات ارادے کی تخلیق ہے۔

دوم، اخلاقیات اپنے ارادے کے تابع ہونے کا نام ہے۔

اس بنیاد پر کانٹ کہتا ہے کہ گو کہ خدا کا ارادہ بھی ارادۂ عمومی ہے، خدا کے ارادے کا اتباع اخلاقیات نہیں بلکہ غیر اخلاقی عمل ہے۔

شنیوئنڈ کے مطابق (ص۔۵۱۱) کانٹ سے پہلے کے 'غیر ارادتی' (Anti-voluntarist) مفکرین بھی بندگی و اطاعت کو برا سمجھتے تھے، لیکن کانٹ نے اس کی ایک منطقی اور وجودی بنیاد فراہم کی۔ کانٹ کے نزدیک بندگی و اطاعت اس لیے غلط ہے کیونکہ یہ انسان کے اندر موجود "Humanity" (ہیومنٹی) کے اس جوہر کی نفی کرتی ہے جو اسے ایک 'آزاد شارع' بناتا ہے۔

جب انسان کسی دوسرے (خواہ وہ خدا ہی کیوں نہ ہو) کے سامنے 'ذلت آمیز' طریقے سے جھکتا ہے، تو وہ اپنی اس کرامت (Dignity) کا سودا کرتا ہے جو اسے ایک 'عقلی وجود' ہونے کی بنا پر حاصل ہے۔ شنیونڈ اس نکتے کی وضاحت کرتا ہے کہ کانٹ کے ہاں اپنی عزت کرنا (Respect for oneself) کوئی تکبر نہیں، بلکہ ایک اخلاقی فریضہ ہے۔

کانٹ کے نزدیک عظمتِ انسانی (Dignity) اس میں نہیں کہ وہ کتنا طاقتور ہے، بلکہ اس میں ہے کہ وہ ان فرائض کی پابندی کرتا ہے جو اس کی اپنی عقل نے اس پر عائد کیے ہیں۔ غیر اطاعتی روح (Non-servile spirit) اخلاقیات کی ضروری شرط ہے۔ اخلاقی عمل وہ ہے جو 'خوف' یا 'لالچ' یا انکساری (Abjectly) کے تحت نہ کیا جائے، بلکہ اس شعور کے ساتھ کیا جائے کہ "میں اس قانون کی اطاعت اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ یہ میرا اپنا بنایا ہوا قانون ہے۔" (کانٹ، اخلاقیات کی مابعد الطبیعیات، ص، ۲۳۲-۲۳۰، انگریزی ترجمہ) [یہ بنیادی طور پر بندگیٔ رب کے بجائے اپنی ذات کی پرستش کا عقیدہ ہے].

خدا اپنے ارادے کے تابع ہے اور انسان کو بھی اخلاقی لحاظ سے صرف اپنے ارادے کی اتباع کرنی چاہیے۔ ان معنوں میں کانٹ کہتا ہے کہ انسان خدا کا شریک بھی ہے اور ہم سفر بھی ہے۔ انسان اور خدا (اور فرشتے) خداؤں کے خاندان کا حصہ ہیں[۵]:

[Kant's] astonishing claim is that God and we can share membership in a single community only if we all equally legislate the law we are to obey. The mature account does not hesitate to make an explicit comparison between human agents and God. When we try to bring about a harmonious totality of all ends, a totality made possible and governed by the moral law, we may think of ourselves "as analogous to the divinity." Leibniz held that in our own sphere we are little divinities but he could not have accepted . . . that will originates morality… For Kant…it is not knowledge of independent and eternal moral truths that puts us on an equal footing with God in the moral

community. It is our ability to make and live by moral law. (Schneewind, pp. 512-513).

شنیونڈ کا یہ اقتباس کانٹ کے فلسفے کے اس منطقی نتیجے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جسے ہم نے اوپر "خدا کے خلاف بغاوت" سے تعبیر کیا تھا۔ یہ محض اخلاقیات کی تبدیلی نہیں ہے، بلکہ یہ کائناتی درجہ بندی (Cosmic Hierarchy) کی از سرِ نو تشکیل ہے۔

شنیونڈ کے نزدیک کانٹ کا سب سے حیران کن دعویٰ یہ ہے کہ خدا اور انسان ایک ہی اخلاقی برادری کے رکن بن سکتے ہیں، لیکن اس کی شرط برابری ہے۔ یہ برابری اس لیے نہیں کہ انسان خدا جتنا طاقتور ہے، نہ اس کی بنیاد علم ہے، بلکہ یہ اس لیے ہے کہ دونوں ایک ہی قانون کے "مساوی شارع" (Equal Legislators) ہیں۔ اگر خدا اخلاقی قانون بناتا اور انسان صرف اس کی اطاعت کرتا، تو کانٹ کے نزدیک یہ "اخلاقی برادری" نہ ہوتی بلکہ "آقا اور غلام" کا رشتہ ہوتا۔

شنیونڈ نے لائبنز (Leibniz) کا حوالہ دے کر ایک بہت گہرا فرق واضح کیا ہے: لائبنز کے مطابق انسان اپنی حدود میں "چھوٹا خدا" (Little Divinity) ہے لیکن وہ اخلاقیات کا خالق نہیں ہے۔ اس کے برعکس کانٹ کے نزدیک انسان کی الوہیت (Analogy to Divinity) اس کے علم میں نہیں بلکہ اس کے "تخلیقِ قانون" میں ہے۔ ہم خدا کے برابر اس لیے کھڑے ہیں کیونکہ ہم قانونِ اخلاق بنانے اور اس پر جینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

شنیونڈ واضح کرتا ہے کہ کانٹ کے ہاں اخلاقی حقائق (Moral Truths) انسان سے باہر کہیں آزادانہ طور پر موجود نہیں ہیں جنہیں عقل دریافت کرے۔ بلکہ عقل خود ان حقائق کو وضع کرتی ہے۔

"It is our ability to make and live by moral law".

یہ جملہ ہیومنزم کا وہ نقطۂ عروج ہے جہاں انسان بندگی کے اقرار کے بجائے "شریکِ خدا" یا خود "خدا" بننے کا دعویٰ کرتا ہے، کیونکہ تشریع (Legislation) قدیم زمانے سے مذہبی فکر میں صرف خدا کا حق تھا۔

کانٹ ان معنوں میں انسان کو اخلاقیات کا خود مختار شارع (legislator) قرار دیتا ہے۔ جیروم شنیونڈ اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ کانٹ نے اخلاقیات بمعنی خود مختاری کا تصور ایجاد کیا۔ اس سے پہلے حکم ذاتی کا تصور موجود تھا، خود مختاری کا تصور موجود تھا لیکن کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ انسان جس اخلاقیات کو اپنی مرضی سے اپنے اوپر لاگو کرتا ہے وہ اس اخلاقیات کی خود تشریع بھی کرتا ہے۔

ہم خود (بطور ہیومن کے) قانون اخلاق کی تشریع کرتے ہیں۔ کانٹ کے نزدیک خیر و شر اخلاقیات کا نتیجہ اور تتمہ ہیں اس کی بنیاد نہیں ہیں۔ خیر وہ ہے جسے ارادۂ انسانی چاہے اور شر وہ ہے جسے ارادۂ انسانی رد کرے۔ ان معنوں میں کانٹ کہتا ہے کہ انسان کا ارادہ اپنی عقلی شکل میں خیر مطلق ہے (کانٹ، عقل عملی، ص، ٦٦)۔

یہی کانٹ کے نزدیک خود مختاری کا مطلب ہے۔ دوسرے الفاظ میں حکم ذاتی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مرضی کے علاوہ کسی اور مرضی کے تابع نہ ہوں۔ لیکن کانٹ یہ کہتا ہے کہ ہم اپنی مرضی کے آپ مالک نہیں ہو سکتے جب تک ہم خود مختار نہ ہوں اور خود مختاری کو واحد جائز عمل کے طور پہ قبول نہ کریں۔ شنیونڈ کے الفاظ میں:

He held that we are self-governing because we are autonomous. By this he meant that we ourselves legislate the moral law. It is only because of the legislative action of our own will that we are under moral law; and the same action is what always enables everyone to be law abiding. Kant was first to argue for autonomy in this strong sense.

کانٹ وہ پہلا فلسفی تھا جس نے خود مختاری (Autonomy) کو ان معنوں میں متعارف کرایا کہ انسان نہ صرف اخلاقی عمل کا مرکز ہے بلکہ وہ اخلاقی قانون کا 'شارع' (Legislator) بھی ہے۔ شنیونڈ کے مطابق، کانٹ کا یہ دعویٰ کہ 'ہم خود قانونِ اخلاق کی تشریع کرتے ہیں'، دراصل انسان کو کائنات کے اخلاقی نظم کا حاکمِ اعلیٰ بنا دیتا ہے۔ یہ تصور

روایتی 'نظامِ اطاعت و رشد و ہدایت' کی جڑیں کاٹ دیتا ہے، کیونکہ یہاں اطاعت کسی 'غیر' (خدا یا روایت) کی نہیں بلکہ اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کی ہے۔

عام طور پر 'حکمِ ذاتی' (Self-governance) سے مراد یہ لی جاتی تھی کہ انسان اپنے معاملات کا خود فیصلہ کرے۔ لیکن کانٹ نے اس تصور کو ایک "نئے معنے" (Strong sense) دیے۔ اس کے نزدیک ہم 'سیلف گورننگ' صرف اس لیے ہیں کیونکہ ہم 'آٹونومس' ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف اپنے فیصلوں کے مالک نہیں ہیں، بلکہ ہم اس قانون کے بھی خالق ہیں جس کے تحت وہ فیصلے کیے جاتے ہیں۔

شنیوند واضح کرتا ہے کہ کانٹ کے نزدیک ہم پر اخلاقی قانون کی پابندی اس لیے لازم نہیں ہے کہ وہ کسی آسمانی صحیفے میں لکھا ہے، بلکہ اس لیے لازم ہے کیونکہ وہ ہمارے اپنے ارادے کی تخلیق ہے۔

"It is only because of the legislative action of our own will that we are under moral law".

یہ جملہ ابراہیمی مذاہبِ اور مابعد الطبیعیات کا نہ صرف انکار ہے بلکہ انسان کی نظری و عملی خدائی کا اعلان ہے جس کے تحت قانون کی 'حاکمیت' کا ماخذ خدا کی ذات سے منتقل ہو کر انسان کے 'ارادے' میں آ گیا ہے۔

خود مختاری کا تقاضا ہے کہ:

- ہم شارع قانون ہوں اور اپنے بنائے ہوئے قانون کے علاوہ کسی اور قانون کے سامنے سر خم نہ کریں۔
- مابعد الطبیعیاتی آزادی (contra causal freedom) کے وجود کا اثبات کیا جائے [٦]۔
- ان معنوں میں بھی انسان خدا کا شریک ہے کہ اس کا ارادہ نہ صرف یہ کہ بشمول خدا کسی اور ارادے کا تابع نہیں ہے بلکہ فطرت سمیت کسی ماورائی حقیقت کا تابع نہیں ہے۔

کانٹ سے پہلے حکمِ ذاتی ماننے والوں میں اور اس کے تصور میں فرق یہ ہے کہ وہ مندرجہ بالا

قضایا کو حکم ذاتی کا لازمی حصہ نہیں گردانتے۔ ان کے برعکس کانٹ کہتا ہے کہ خدا کی اطاعت اور عبادت فی نفسہٖ ایک غیر اخلاقی عمل ہے اور ہیومنٹی کی توہین ہے۔ یہی حال فطرت وطبیعت و ماورائی حقائق کی اتباع کا ہے۔ کانٹ عبادت و اطاعت کو ہیٹرونمی کہتا ہے اور ہیٹرونمی خود مختاری کی ضد ہے۔ جو ان معنوں میں خود مختاریت کا انکار کرے وہ کانٹ کے نزدیک اپنی انسانیت کو کھو دیتا ہے۔

حکم ذاتی (self-governance) کا مطلب یہ ہے کہ منفی طور پر انسان کسی اور انسان کے تابع نہ ہو۔ حکم ذاتی کے علمبرداروں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہر فرد اخلاقی امور کے بارے میں جاننے کی اہلیت رکھتا ہے اس کے لیے اسے چرچ یا کسی اور بالا اتھارٹی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ حکم ذاتی لازماً خود مختاری (Autonomy) کو متصور نہیں کرتا ہے۔ مثلاً حکم ذاتی کا قائل خدا کے ارادے کا اتباع کر سکتا ہے اس طور پر کہ وہ سمجھتا ہو کہ خدا کا ارادہ حق ہے اور وہ اپنے آزاد مرضی سے اس ارادے کے تابع ہے۔ یہ عمل کانٹ کی اصطلاح میں ہیٹرونومی ہو گا لیکن یہ رویہ حکم ذاتی کے قاعدے سے باہر نہیں ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکم ذاتی کا قائل منفی آزادی کو ضروری سمجھتا ہے لیکن مثبت آزادی کے کسی خاص تصور کو حکم ذاتی کے لیے ضروری نہیں سمجھتا۔

خود مختاری (Autonomy) کا تصور حکم ذاتی کو فرض کرتا ہے لیکن وہ حکم ذاتی سے آگے کی چیز ہے۔ خود مختاری کا تصور مثبت آزادی کے خاص تصور کو فرض کرتا ہے۔ اس تصور کے مطابق انسان کو مثبت معنوں میں بھی اپنے ارادے کا تابع ہونا چاہیے۔ انہی معنوں میں وہ خود مختار ہے کہ وہ اپنے ارادے کا تعین خود کرتا ہے۔ اس کو self-determination کہتے ہیں۔

کانٹ کا تصور ان دونوں تصورات سے آگے کی چیز ہے۔ وہ حکم ذاتی اور خود مختاری کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ انسان خود مشرع (legislator) ہو۔ وہ کہتا ہے کہ انسان جب اپنے بنائے ہوئے آفاقی قانون پر ان معنوں میں سر خم کرتا ہے کہ وہ اس کا اپنا بنایا ہوا

قانون ہے تو تب وہ حقیقی معنوں میں خود مختار ہوتا ہے۔ ان معنوں میں کانٹ اخلاقیات کو خود مختاری کے طور پر متصور کرتا ہے:

- کانٹ یہ کہتا ہے کہ مثبت آزادی کے اس خاص تصور کے علاوہ تمام تصورات ہیٹرو منی پر منتج ہوتے ہیں۔
- اور خود مختاری کا یہ تصور اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اخلاقیات کی ایک نئی تعریف کریں یا ایک نئے تصور کو جنم دیں جس کے مطابق اخلاقیات خود مختاری کا دُوسرا نام ہے۔

کانٹ اس قسم کی انسان پرستانہ اخلاقیات کے فروغ کے لیے موزوں شخص تھا۔ وہ پروٹیسٹنٹ عیسائی گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا نظریہ تمام انسانوں کی ممکنہ مساوی الوہیت کے لیے ایک قسم کا ماڈل فراہم کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ لوتھر نے عیسائیت کے عبادتی و اطاعتی پہلو کے خلاف جو محاذ کھڑا کیا تھا وہ کم از کم علمی و فلسفیانہ ثقافت کا حصہ بن چکا تھا۔ کانٹ کا ایک مشہور سوانح نگار لکھتا ہے کہ: کانٹ خدائے متعال پر مطلق توکل کو غلامانہ ذہنیت (servile attitude/knechtische Gemütsart) کا عکاس سمجھتا تھا اور اس کو اس قسم کے طرز عمل سے سخت نفرت تھی اور وہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

## کانٹ کا تصور خدا اور تصور انسان

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کانٹ کے تصور خدا اور اس کے تصور انسان کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہے کانٹ خدا کے وجود کا انکار نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا تصور خدا اس کے تصور تاریخ اور تصور اخلاقیت کا ایک اہم ضمیمہ ہے۔ اس سلسلے میں جو چیز اہم ہے وہ اس کا تصور خدا ہے۔ عموماً جدید مغربی تہذیب کے ضمن میں خدا کے وجود کا انکار اتنا اہمیت نہیں رکھتا جتنا مختلف نظریات میں مضمر خدا کے تصور کی اہمیت ہے۔

اس سے قرآن کی لازوال حکمت کی تاریخی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ قران خدا کے وجود کا

انکار کرنے والوں کے خلاف زیادہ وقت صرف نہیں کرتا بلکہ خدا کے غلط تصورات کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ جو چیز مغربی تہذیب کی بنیاد ہے وہ شرک ہے۔ جو لوگ خدا کے وجود کا مطلق انکار بھی کرتے ہیں جیسے مارکس اور اس کے پیروکار وہ بھی اس کے مقابلے میں ایک نئے خدا کا تصور پیش کرتے ہیں۔

بہر حال اس استطراد کے بعد ہم کانٹ کے تصور خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کانٹ کا تصور خدا تین مختلف منابع سے مستفید ہوتا ہے اور ان تین فکری دھاروں کا ایک طرح سے ائتلاف ہے۔

● ارسطو کا تصور خدا جس کے مطابق خدا عقل محض یا زیادہ بہتر تعبیر کے مطابق فکر محض ہے۔ ارسطو کے نزدیک خدا مادے سے بالکل عاری ہے کیونکہ اس کے نزدیک مادے کا تعلق ممکنات سے ہے جبکہ خدا اس کے نزدیک کامل ہے اس میں کوئی امکان نہیں وہ فعالیت محض ہے۔ خدا ایک ایسی فکر ہے جو اپنے آپ کو سوچ رہی ہے (thinking of thinking/noēsis noēseōs)۔ ارسطو کا خدا نہ خالق ہے اور نہ کوئی ذات ہے (یہ آخری دعویٰ مختلف فیہ ہے)۔ اس لحاظ سے اسکا تصور خدا عیسائی تصور خدا سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن خدا علت غائی ہے جو خود حرکت نہیں کرتا لیکن ہر چیز کا محرک ان معنوں میں ہے کہ وہ ہر چیز کا ہدفِ تکمیل ہے (وہ انہی معنوں میں پہلا محرک first mover ہے)۔ اس لحاظ سے اس تصور خدا کو کائناتی قوت یا روح کائنات کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

● افلاطون کے تصور خدا، جہاں تک کانٹ کے تصور خدا کے لیے ضروری ہے، کے دو اہم نکات پیش کیے جانے چاہئیں۔ افلاطون کا خدا یونانی فلسفیوں کے عمومی تصور کے مطابق خالق نہیں ہے۔ وہ مصور ہے۔ وہ کائنات کا دست کار ہے، لیکن نہ تو وہ مادے کو تخلیق کرتا ہے نہ اشیاء کی صورت کو تخلیق کرتا ہے۔ مادہ بھی موجود ہے اور مثالی صورت بھی موجود ہے۔ خدا ان دونوں کو ملا کر انفرادی اشیاء کو متشکل کرتا ہے۔ دوسرا ایک اہم تصور افلاطون کا یہ ہے کہ خدا سب سے اعلیٰ وجود نہیں ہے بلکہ خدا سے اوپر بھی ایک وجود ہے جو خدا کے وجود سے بھی

بالا ہے۔ اس کو وہ خیر مطلق (Good) کہتا ہے۔ یہ خیر یا خیر کل کی مثالی صورت، طاقت عظمت اور قدر میں ہر وجود بشمول خدا کے جود سے بالاتر ہے اور تمام وجود اسکا مرہون منت ہے( beyond being in dignity and power" / ἐπέκεινα τῆς οὐσίας).

● تیسرا عیسائیت کا تصور خدا ہے جس کے مطابق خدا ایک ذات ہے وہ خالق ہے۔ لیکن عیسائیت یہ تصور بھی دیتی ہے کہ کم از کم ایک انسان ایسا بھی تھا، جو بیک وقت خدا بھی تھا اور انسان بھی تھا۔

ارسطو سے کانٹ نے خدا کے فکر محض ہونے کا تصور لیا ہے اور افلاطون سے اس نے یہ تصور لیا ہے کہ خدا سے بالا بھی کوئی حقیقت ہو سکتی ہے اور خدا اس کے تابع ہے۔ عیسائیت سے اس نے خدا کے ذات ہونے اور خالق ہونے کا تصور لیا اور یہ تصور لیا کہ خدا فکر بھی ہے اور ارادہ بھی ہے۔

کانٹ کا انسان کا تصور یہ ہے کہ انسان دو مختلف فطرتوں کا امتزاج ہے۔ ایک طرف اس کا حیوانی وجود ہے اور اس حیوانی وجود کے لحاظ سے وہ ظاہر ہے کہ خدا کے برابر نہیں ہے۔ لیکن انسان کا ایک دوسرا وجود بھی ہے، جو اس کا عقلی وجود ہے اور یہ عقلی وجود ارسطو کی پیروی میں کانٹ کے نزدیک ایک الوہی حقیقت ہے۔ اسی طرح کانٹ یہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اس عقلی حقیقت کا عقلی ارادہ بھی ہے جو اس کے حیوانی ارادے سے بالا ہے۔

کانٹ نے خدا کے ارادے سے اخلاقیات کا تعلق مکمل طور پر کاٹ دیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سفر میں خدا کا کوئی رول نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کانٹ کے نزدیک انسان نامکمل خدا ہے۔ ان معنوں میں کہ انسان دو جوہروں سے مل کے بنا ہے۔ ایک جوہر اس کی عقل ہے اور یہ جوہر خود اس کی خدائی کی بنیاد ہے اور دوسرا جوہر اس کی حیوانیت ہے۔ اس کے برعکس خدا، مکمل خدا ان معنوں میں ہے کہ اس میں حیوانیت نہیں ہے وہ جسم نہیں ہے۔ ان معنوں میں انسان نامکمل ہے اور ناقص ہے جبکہ خدا مکمل اور غیر ناقص ہے۔

کانٹ کے نزدیک مادی کائنات تغیر و تبدل، فساد اور فنا (Decay and Destruction) کا مجموعہ ہے، جہاں ہر چیز مادی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن انسان ایک 'دوغلی' حیثیت رکھتا ہے: وہ ایک طرف جسم ہے جو فانی اور مادی دنیا کا حصہ ہے۔ دوسری طرف وہ عقلی وجود ہے جو ان مادی زنجیروں سے ماوراہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

کانٹ کے لیے انسانی روح کی لافانیت محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں، بلکہ ایک "اخلاقی" ضرورت ہے۔ چونکہ انسان اس محدود دنیا میں رہتے ہوئے مکمل اخلاقی کمال (Perfect Virtue) حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے عقل یہ تقاضا کرتی ہے کہ ایک ایسی زندگی ہو جہاں وہ مادی احتیاج (Finite things) سے آزاد ہو کر 'لامتناہی ہستی' (Infinite Being) بن کر خدا اور دوسری کامل موجودات کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہو سکے۔

کانٹ کا انسانی عظمت کا نظریہ، تصورات تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کو ایک لافانی وجود کے طور پر دیکھتا ہے جو مادی دنیا کے زوال اور فنا سے بالاتر ہے۔ کانٹ کا ہیومنزم انسان کو اس لیے 'مطلق' قرار دیتا ہے کیونکہ وہ مادی احتیاج سے نجات پا کر 'لامتناہی ہستی' کے ساتھ نہ صرف "اخلاقی" بلکہ حقیقی وجودی رفاقت (Fellowship) کا بھی اہل ہے۔

تاریخ میں کانٹ کے نزدیک خدا کا رول یہ ہے کہ وہ انسان کی مدد کرتا ہے کہ وہ تاریخی سفر کے ذریعے اپنی تکمیل کرے۔ خدا ایک قسم کا آئیڈیل ہے جس کی طرف انسان سفر کرتے ہوئے اپنی حیوانیت سے مکمل طور پر اوپر اٹھ کر اپنی خدائی کی تکمیل کرے گا۔ اس کا ذریعہ جیسا کہ کہا گیا تاریخ ہے لیکن کانٹ کی اپنی تحریروں میں اس کی پوری توضیح نہیں ملتی کہ یہ عمل کیوں کر مکمل ہو گا۔ عمومی طور پہ وہ کہتا ہے کہ اس کا طریقہ انٹرنیشنل سرمایہ دارانہ لبرل آرڈر کا قیام ہو گا۔ اس کی مکمل توضیح بعد میں اس کے شاگردوں مثلاً ہیگل اور مارکس نے کی جنہوں نے اس تاریخی سفر کی تفصیل اپنے اپنے انداز میں بیان کی جس کے ذریعے انسان تاریخی کشمکش کے ذریعے نامکمل خدا سے مکمل خدا بنتا ہے۔ یہی تاریخ کا مقصد ہے اور ہیگل اور مارکس کے نزدیک تاریخ کا سفر اس وقت ختم ہو گا جب انسان مکمل ہو جائے گا یعنی مکمل خدا

بن جائے گا۔ اسی کو کانٹ نے جنت (Kingdom of Ends) کا نام دیا۔ ہیگل و مارکس نے انہی معنوں میں دنیا کو جنت بنانے کی کشمکش کو تاریخ کا جوہر قرار دیا۔ یہی ساری مغرب تہذیب اور اور سرمایہ داری کا بنیادی ہدف ہے؛ چاہے وہ لبرلزم کی شکل میں ہو، چاہے وہ کمیونٹیریمزم کی شکل میں، اور کانٹ کی فکر ان دونوں نظریات کی مشترکہ بنیادیں فراہم کرتی ہے۔

## کانٹ کا اسلامی محاکمہ

آزادی کے نام پر خدا کے خلاف جو بغاوت لوتھر نے شروع کی تھی اور جو کانٹ کی فکر میں اپنی اوج پر پہنچتی ہے بنیادی طور پر عبادت رب اور اس کی بنیاد پر قائم فرد، معاشرت، اور ریاست کے تصور کے خلاف بغاوت تھی۔ یہ بغاوت ابلیسی فکر پر استوار ہے جس کا مقصد دنیا میں جنت کا قیام اور انسان کی ایسی خدائی کا قیام ہے جس کو کبھی زوال نہ ہو گا۔ قرآن عظیم الشان نے اس ابلیسی فکر کی تصویر کشی یوں کی ہے:

﴿فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ﴾ [طٰہٰ:۱۲۰]

ترجمہ: پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا، اس نے کہا: اے آدم! کیا میں تمہیں ہمیشگی کے درخت اور ایسی بادشاہت کا راستہ نہ دکھاؤں جو کبھی پرانی نہ ہو (جسے کبھی زوال نہ آئے)؟

التفسیر: فوسوس الشيطان لآدم وقال له: هل أدلك على شجرة، إن أكلت منها خُلِّدتَ فلم تمت، وملكت مُلْكًا لا ينقضي ولا ينقطع؟

تفسیر کا ترجمہ: پھر شیطان نے آدمؑ کے دل میں وسوسہ ڈالا اور ان سے کہا: کیا میں آپ کو ایک ایسے درخت کا پتہ نہ دوں کہ اگر آپ اس سے کھالیں تو ہمیشہ زندہ رہیں گے اور آپ کو کبھی موت نہیں آئے گی، اور آپ ایک ایسی سلطنت کے مالک بن جائیں گے جو کبھی ختم ہو گی نہ منقطع؟

آیتِ مبارکہ میں شیطان کا آدم علیہ السلام کو شجرۃ الخلد (ہمیشگی کا درخت) اور ملک لا یبلی (ایسی بادشاہت جو منقطع نہ ہو / زوال پذیر نہ ہو) کا لالچ دینا دراصل اس انسانی الوہیت کے فتنے کی قدیم ترین جڑ ہے جس کی جدید فلسفیانہ تشریح ہمیں کانٹ، ہیگل اور مارکس کے ہاں ملتی ہے۔

کانٹ کا فلسفہ دراصل اسی قدیم شیطانی وسوسے کی جدید علمی تدوین ہے جس کا ذکر سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۰ میں کیا گیا ہے۔ شیطان نے آدمؑ کو 'ہمیشگی' اور 'لازوال اقتدار' کا جو خواب دکھایا تھا، کانٹ نے اسے 'خود مختار عقل' (Autonomous Reason) اور 'تاریخی ارتقاء' کا نام دے کر جدید مغربی تہذیب کی بنیاد بنا دیا۔ جدید ہیومنزم، لبرلزم اور سرمایہ دارانہ نظام دراصل اسی 'شجرۃ الخلد' کی تلاش ہے جہاں انسان خدا کی بندگی سے آزاد ہو کر خود اپنی خدائی کا اعلان کر سکے۔ اسلامی انقلابی فکر کا کام اس 'خدا نما انسان' کے بت کو پاش پاش کرنا اور انسان کو دوبارہ اس کے اصل مقام 'عبدیت' پر واپس لانا ہے۔

شیطان کا دوسرا وعدہ "ملک لا یبلی" (لازوال سلطنت) تھا۔ کانٹ نے جس "انٹرنیشنل لبرل آرڈر" یا "کنگڈم آف اینڈز" (Kingdom of Ends) کا تصور دیا، وہ دراصل اسی 'لا زوال انسانی بادشاہت' کی فلسفیانہ شکل ہے۔ کانٹ، ہیگل اور مارکس کے نزدیک تاریخ کا مقصد ایک ایسی عالمی ریاست یا معاشرے کا قیام ہے جہاں انسان اپنی مادی و اخلاقی ضروریات پر مکمل حاکم ہو۔ یہ 'عالمی سرمایہ داری' یا 'کمیونزم' دراصل اسی "ملک لا یبلی" کی تلاش ہے جہاں انسان وحیِ الٰہی سے آزاد ہو کر اس زمین پر اپنی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہے۔

لیکن آزادی کے نام پر خدائی عبادت کا انکار انسان کو آزاد نہیں کرتا بلکہ اسے خواہشات کی زنجیر میں جکڑ دیتا ہے۔ انسان آزاد نہیں ہوتا لیکن بلکہ خواہشات کو اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ کلام مجید میں ارشاد ہے

﴿ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴾ [الجاثیہ:۲۳]

ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش (نفس) کو اپنا خدا بنالیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں چھوڑ دیا، اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا؟ تو اللہ کے بعد اب اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے؟

التفسير: أفرأيت -أيها الرسول- من اتخذ هواه إلهًا له، فلا يهوى شيئًا إلا فَعَله، وأضلَّه الله بعد بلوغ العلم إليه وقيام الحجة عليه، فلا يسمع مواعظ الله، ولا يعتبر بها، وطبع على قلبه، فلا يعقل به شيئًا، وجعل على بصره غطاء، فلا يبصر به حجج الله؟ فمن يوفقه لإصابة الحق والرشد بعد إضلال الله إياه؟ أفلا تذكرون -أيها الناس- فتعلموا أنَّ مَن فَعَل الله به ذلك فلن يهتدي أبدًا، ولن يجد لنفسه وليًا مرشدًا؟ والآية أصل في التحذير من أن يكون الهوى هو الباعث للمؤمنين على أعمالهم.

تفسیر کا ترجمہ: اے رسول! کیا آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے؟ وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے اسی کی پیروی کرتا ہے۔ اللہ نے اس تک علم پہنچ جانے اور اس پر حجت قائم ہو جانے کے بعد اسے گمراہی میں چھوڑ دیا، چنانچہ وہ نہ اللہ کی نصیحتیں سنتا ہے اور نہ ان سے کوئی عبرت حاصل کرتا ہے۔ اللہ نے اس کے دل پر مہر لگادی ہے، اس لیے وہ کچھ سمجھ نہیں پاتا، اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، اس لیے وہ اللہ کی حجتیں دیکھ نہیں پاتا۔ پھر اللہ کے بعد اسے حق اور ہدایت کی طرف کون لا سکتا ہے؟ اے لوگو! کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے تاکہ جانو کہ جس کے ساتھ اللہ ایسا معاملہ کر دے وہ کبھی ہدایت نہیں پاسکتا اور نہ اپنے لیے کوئی راہ دکھانے والا مددگار پائے گا۔ یہ آیت اس بات کی اصل بنیاد ہے کہ مومنوں کو اس امر پر متنبہ کیا جائے کہ ان کے اعمال کا محرک ان کی ہوائے نفس (خواہشات) نہ بن جائے۔

کانٹ کا دعویٰ ہے کہ انسان جب اپنی عقل کے مطابق قانون سازی کرتا ہے تو وہ "خود مختار" (Autonomous) ہوتا ہے۔ لیکن قرآن اس نام نہاد خود مختاری کی حقیقت بیان کرتا ہے کہ جب انسان وحیِ الٰہی سے آزاد ہو کر اپنی عقل کو "مطلق" (Absolute) مان لیتا ہے، تو وہ درحقیقت اپنی "ہوا" (خواہش / نفس) کو اپنا خدا بنالیتا ہے۔ کانٹ کا 'مشرعِ خود مختار' دراصل وہی وجود ہے جس نے اپنی خواہشاتی عقل کو الٰہ کا درجہ دے دیا۔ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۰ سے یہ واضح ہوا کہ اس فتنے کی جڑ 'ابدیت اور لازوال اقتدار' کا شیطانی وسوسہ ہے، اور سورہ الجاثیہ کی آیت ۲۳ نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اس فکری خود مختاری کا انجام 'علمی ضلالت' اور 'قلبی مہر' کے سوا کچھ نہیں۔

جدید ہیومنزم انسان کو 'خدا' بنانے کا وعدہ کر کے اسے درحقیقت 'ہوائے نفس' کا غلام بنا دیتا ہے۔ اسلامی انقلابی فکر کا پیغام یہ ہے کہ حقیقی علم اور بصیرت صرف اللہ کی بندگی میں ہے، اور جو اپنی عقل کو وحی سے آزاد کر کے خود مختاری کا دعویٰ کرتا ہے، اسے اللہ کے بعد کوئی ہدایت دینے والا نہیں (فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللّٰه)۔

کانٹ اطاعت سے آزاد انفرادی اور اجتماعی اخلاقیت کا داعی تھا، جس میں ہر فرد مالک الملک ہو گا، معاشرہ مساوات اور آزادی کا مظہر ہو گا اور ریاست ان مساوی افراد اور معاشرت کی خادم ہو گی۔ لیکن جس طرح آزادی ایک سراب ہے اسی طرح اطاعت سے پاک اخلاقیات اور معاشرت بھی ایک سراب ہے۔ لبرل معاشرت میں 'برابری' کا دعویٰ تو کیا جاتا ہے، لیکن عملاً یہ نظام صرف ان لوگوں کے لیے 'آزادی' فراہم کرتا ہے جن کے پاس وسائل (Capital) ہوں۔ یوں ریاست درحقیقت سرمایہ دار طبقے کی محافظ بن جاتی ہے اور فرد کی 'خود مختاری' ایک قانونی افسانے (Legal Fiction) سے زیادہ کچھ نہیں رہتی۔

جیسا کہ کانٹ کا سب سے بڑا امریکی متبع جان رالز کہتا ہے آزادی کے نام پر قائم معاشرے و ریاست کا مقصدِ وحید (end) وسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے آزادی کے نام پر جو معاشرت اور ریاست قائم ہوتی ہے وہ بڑھوتری برائے بڑھوتری کی عقلیت کی غلام ہوتی ہے

اور معاشرے و ریاست میں ان لوگوں کے حکمرانی اور تسلط قائم ہو جاتا ہے جو اپنے آپ کو اس عقلیت کا اسیر کل بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ بڑھوتری برائے بڑھوتری کے عمل کو کس طرح فروغ دیا جائے۔ اس لیے عملاً آزادی کے نام پر جو معاشرت قائم ہوتی ہے وہ بھی مراتب کے لحاظ پر مبنی ہوتی ہے فرق یہ ہے کہ کہ غیر سرمایہ دارانہ معاشرتوں کے برعکس اس معاشرت میں ان لوگوں کا غلبہ ہوتا ہے اور ان لوگوں کی معاشرتی فوقیت تسلیم کی جاتی ہے جو حرص و حسد کی عقلیت کے علمی و عملی امام ہوتے ہیں۔ وہ معاشرہ جو "آزادی اور مساوات" کے نام پر بنا تھا، عملاً ایک ایسی سخت مراتب پر مبنی معاشرت بن جاتا ہے جہاں "کامیاب" وہ ہے جو حرص کے عالمی کھیل کا بہترین کھلاڑی ہے۔ یہاں 'تقویٰ' کی جگہ 'پیشہ ورانہ مہارت' (Professionalism) اور 'بندگی' کی جگہ خواہشات کی غلامی اور 'مسابقت' (Competition) لے لیتی ہیں۔

تاریخی طور پہ کانٹ کے اخلاقی نظریے پر جو تنقید ہوئی ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ گو کے کانٹ عقلِ محضِ عملی (pure practical reason) پر مبنی اخلاقیات کا تصور پیش کرتا ہے جس میں حیوانی خواہشات کا کوئی رول نہیں ہے، کانٹ کی عقلِ محض عملی حقیقتاً اخلاقیات کا صرف مجرد فریم ورک فراہم کرتی ہے۔ کانٹ کے اخلاقی نظام کی اس بنیادی کمزوری کو فلسفے کی زبان میں "صورت پرستی" (Formalism) کا بحران کہا جاتا ہے۔ ہیگل (Hegel) اور بعد کے ناقدین کے مطابق کانٹ کی عقل ایک ایسا خالی برتن ہے جس کے پاس اپنا کوئی مواد (Content) موجود نہیں۔ جیسا کہ کانٹ خود تسلیم کرتا ہے اس عملی ریزن کا مواد (content) خواہشات ہی فراہم کرتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کانٹ کے عقلی اخلاقیاتی فریم ورک کا مقصد خواہشات کو ریزن کے معیارات کے مطابق ترتیب دینا ہے۔

کانٹ کے سامنے دو راستے ہیں یا تو وہ خواہشات کو رد کر دے اور عقل محض کو اخلاقیات کا ضروری اور کافی ذریعہ سمجھے یا عقل کو محض ایک فریم ورک سمجھے جس میں خواہشات مواد

بھریں۔

پہلی صورت میں اخلاقیات محض ایک خالی فریم ورک ہے جس کا کوئی مواد نہیں جو ظاہر ہے کہ فرد و معاشرے کے لیے کوئی عملی اخلاقیات فراہم نہیں کر سکتا۔ دوسری صورت میں اخلاقیات عقل محض پر قائم نہیں رہے گی کیونکہ ہماری خواہشات اس کا مواد فراہم کریں گی ۔ عملاً جیسا کہ کانٹ کے نظریۂ اخلاقیات پر تنقید اور خود سرمایہ دارانہ معاشروں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے عقلی فریم ورک کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ خواہشات کے سامنے بند باندھ سکے اور انہیں ریزن کے احاطے میں رکھ سکے۔

جب عقل محض ایک ڈھانچہ بن کر رہ جائے، تو خواہشات (Desires) اس ڈھانچے میں رنگ بھرتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ تاریخ میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقل نے خواہشات کو قابو کرنے کے بجائے، ان کے لیے "عقلی جواز" (Rationalisation) فراہم کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً حرص (Greed) ایک حیوانی جبلت تھی، لیکن اسے "معاشی عقلیت" (Economic Rationality) کے فریم ورک میں ڈال کر ایک اخلاقی قدر بنا دیا گیا۔ اس طرح کانٹ کا پروجیکٹ فیل ہوتا ہے۔

کانٹ کا مقصد انسان کو خواہشات کی غلامی سے نکال کر عقل کی بادشاہت میں لانا تھا، لیکن عملاً یہ ہوا کہ عقل خود خواہشات کی لونڈی بن گئی:

- پہلا راستہ (خالی فریم ورک): اگر ہم صرف عقل کی سنیں، تو زندگی خشک اور بے عمل ہو جاتی ہے کیونکہ عقل عمل کی ترغیب (Motivation) نہیں دے سکتی۔ ریزن ایک خالی برتن ہے۔ ہائیڈیگر کے الفاظ میں اس کا بیان (discourse) خامشی (silence) ہے۔
- دوسرا راستہ (خواہشات کا مواد): اگر ہم خواہشات کو مواد بننے دیں، تو اخلاقیات "مطلق" نہیں رہتی بلکہ "تجرباتی" (Empirical) اور "مصلحت آمیز" ہو جاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اسی لیے فرمایا: "أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ"۔ جب عقل وحیِ الٰہی کے فراہم کردہ مواد سے محروم ہو جاتی ہے، تو وہ اپنی "خالی صورت" کو بھرنے کے لیے

"ہوائے نفس" کا سہارا لیتی ہے۔

کانٹ کا پروجیکٹ اس لیے فیل ہوا کیونکہ اس نے عقل کو "خدا" تو بنا دیا، لیکن اس خدا کے پاس انسانوں کو دینے کے لیے کوئی "ہدایت" (Content) نہیں تھی، سوائے ایک بے جان ریاضیاتی فریم ورک کے۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ کانٹ کی اخلاقیات ایک ایسی کھوکھلی عمارت ثابت ہوئی جس میں مواد کی جگہ خواہشاتِ نفس نے لے لی۔ سرمایہ دارانہ معاشرت نے اس عقلی فریم ورک کو استعمال کرتے ہوئے 'حرص و حسد' کو ایک نظام کی شکل دے دی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عقل جب تک وحی کے تابع نہ ہو، وہ خواہشات کو لگام دینے کے بجائے ان کی ڈھال بن جاتی ہے۔

عملاً یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے عامۃ الناس حیوانی خواہشات کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں اور خواہشات کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ عوام کو سرمایہ داری سے وفادار رکھنے کے لیے اور ان کو سرمایہ داری کے رنگ میں رنگنے کے لیے خواہشات اور سرمایہ دارانہ قانون کو اور اس کے جبر کو بطور آلے کے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ معاشرے کے عظیم اکثریت کا حال ہوتا ہے۔

دوسری طرف ایک چھوٹی سی اقلیت ہوتی ہے جو مجرد عقلی سطح پر زندگی گزارتی ہے۔ اس کی وفاداری سرمایہ داری سے اور اس کی عقلیت سے مجرد سطح پر ہوتی ہے جس کی بنیاد ایک خاص قسم کی علمیت اور عقلیت (ریشنلٹی) ہوتی ہے جس کو وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنے اندر راسخ (inculcate) کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں حسب مراتب اس طرح کام کرتا ہے کہ یہ چھوٹی سی اقلیت معاشرتی سطح پر بھی اور ریاستی سطح پر بھی حکمرانی بھی کرتی ہے اور آئیڈیل بھی فراہم کرتی ہے۔

(ان دونوں گروہوں کے درمیان ربط کے لیے ایک تیسرا گروہ بھی ہوتا ہے مثلاً فنکار اور پوری لہو لعب کی انڈسٹری لیکن اس کی تفصیل میں یہاں جانے کا موقع نہیں ہے)

دونوں سطح پر جو اخلاقیات قائم ہوتی ہے وہ اطاعتی اخلاقیات ہی ہوتی ہے۔ جس چیز کے

اطاعت ہو رہی ہوتی ہے وہ خواہشات اور بڑھوتری برائے بڑھوتری کی منطق ہی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی کانٹ کا پروجیکٹ فیل ہوتا ہے۔

کانٹ نے سوچا تھا کہ ہر فرد "مشرع" (Legislator) بنے گا، لیکن عملاً معاشرہ دو واضح طبقات میں بٹ گیا:

- عقلی اشرافیہ (Technocratic Elite): وہ مٹھی بھر لوگ جو سرمایہ دارانہ قانون اور "عقلیت" کے ماہر ہیں اور جانتے ہیں کہ سرمایے کے جبر کو کیسے برقرار رکھنا ہے۔
- عامۃ الناس (The Proletariat of Desires): وہ عظیم اکثریت جسے "آزادی" کے نام پر صرف اپنی خواہشات کی تسکین میں الجھا دیا گیا ہے۔ ان کی زندگی حیوانی سطح پر ہی رہتی ہے، جہاں ان کا واحد مقصد 'پیداوار' اور 'صرف' (Consumption) ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں "خواہش" (Desire) فرد کا نجی معاملہ نہیں رہتی ہے، بلکہ یہ ایک سیاسی و معاشرتی ہتھیار (technology of government) بن جاتی ہے جسکا مقصد بیک وقت فرد کو سرمایہ داری کے رنگ میں رنگنا، سرمایہ دارانہ فرد کی تشکیل، اور اس کو سرمایہ دارانہ نظامِ بڑھوتری برائے بڑھوتری سے منتھی رکھنا ہوتا ہے۔

عوام کو نظام کا وفادار رکھنے کے لیے:

- ان کی حیوانی جبلتوں کو مشتعل کیا جاتا ہے (اشتہارات اور میڈیا کے ذریعے)۔
- انہیں ایک ایسی دوڑ میں لگا دیا جاتا ہے جہاں وہ مادی اشیاء کے حصول کو ہی 'آزادی' سمجھتے ہیں۔
- سرمایہ دارانہ قانون اس "خواہش کی منڈی" کی حفاظت کرتا ہے، اور یوں جبر ایک قانونی اور عقلی لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔

یہ وہی مقام ہے جہاں اوپر پیش کردہ آیت اپنی پوری معنویت کے ساتھ واضح ہوتی ہے۔ جب 'علم' اور 'عقل' کا مقصد صرف مادی فوائد اور خواہشات کی تنظیم رہ جائے، تو معاشرہ 'اجتماعی گمراہی' کا شکار ہو جاتا ہے۔ عام آدمی اس قدر خواہشات کا اسیر ہو جاتا ہے کہ اسے کائنات کی

مابعد الطبیعیاتی حقیقتیں نظر آنا بند ہو جاتی ہیں۔ اس کا "سمع و بصر" صرف برانڈز اور مادی سہولیات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی مسئلے کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ خواہش کہ دو پہلو ہیں۔ فرد جب تک خواہش کی تحدید کی اخلاقیات سے منسلک ہوتا ہے، اس وقت تک اس میں یہ استطاعت ہوتی ہے کہ وہ خواہشات کو اپنے ارادے اور مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرے۔ لیکن جب وہ خواہشات کی تحدید کی اخلاقیات کو رد کر دیتا ہے اور خواہشات کی تکمیل کی اخلاقیات کو اپناتا ہے تو خواہشات اس کے ارادے کی تکمیل کا ذریعہ نہیں رہتیں بلکہ خواہش ایک آزاد قوت کے طور پر اس کے ارادے پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں خواہشات افراد کے بدن اور ان کی عقل اور ارادے کو اپنی غیر ارادی منطق کی تکمیل کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس لیے جب فرد آزادی پر مبنی اخلاقیات کا اسیر ہو جاتا ہے تو وہ حقیقتاً جس چیز کا اسیر ہوتا ہے وہ اس کے ارادے سے آزاد خواہشات ہوتی ہیں جن کا اپنا مستقل ارادہ اور منطق ہوتی ہے جو فرد کے ارادے سے آزاد ہوتی ہے۔ معاشرہ مجموعی طور پر خواہشات کا اسیر ہو جاتا ہے تو خواہشات خود مختار حقیقت کے طور پر انفرادی اور معاشرتی ارادوں پر حاوی ہو جاتی ہیں اور ان کی سمت متعین کرتی ہیں۔

روایتی اور اسلامی اخلاقیات کی بنیاد 'تحدیدِ خواہش' پر ہے، جہاں عقل اور وحی خواہش کو ایک دائرے میں رکھتی ہیں۔ اس صورت میں 'ارادہ' (Will) خواہشات پر حاکم رہتا ہے اور خواہش ایک 'توانائی' کے طور پر ارادے کے مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔ کانٹ اور لوتھر کی شروع کردہ 'آزادی' نے جب اخلاقیات کی بنیاد 'تکمیلِ خواہش' پر رکھی، تو ارادہ اپنی حاکمیت کھو بیٹھا۔ اب ارادہ خواہش کو استعمال نہیں کرتا، بلکہ خواہش ارادے کو بطورِ 'آلہ' (Instrumental Reason) استعمال کرتی ہے۔

جب خواہش تحدیدی اخلاقیات سے آزاد ہوتی ہے، تو وہ ایک 'غیر ارادی منطق' (Non-voluntary Logic) کے تابع ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں 'حرص' ایک ایسی

خود مختار قوت بن چکی ہے جو اب فرد کے کنٹرول میں نہیں۔ فرد چاہتا ہے کہ وہ رک جائے، لیکن مارکیٹ کی منطق، اشتہارات اور بڑھوتری کا جنون اسے مزید 'صرف' (Consumption) پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں فرد کا اپنا ارادہ معطل ہو جاتا ہے اور وہ خواہش کے بدن (Body of Desire) کا محض ایک پرزہ بن جاتا ہے (مشہور پس جدیدی فلسفی گل ڈیلوز سرمایہ داری کو خواہش پیدا کرنے والی مشین desiring machine کہتا ہے)۔

جب پورا معاشرہ اس 'غیر ارادی منطق' کا اسیر ہو جاتا ہے، تو اجتماعی سطح پر ایک ایسا خود مختار نظام (Autonomous System) قائم ہو جاتا ہے جس کی اپنی ایک سمت ہوتی ہے۔ فرد سمجھتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے انتخاب کر رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اس 'خواہش کی لہر' میں بہہ رہا ہوتا ہے جس کا رخ سرمایہ دارانہ اشرافیہ اور معاشی قوانین متعین کرتے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں انسان 'آزادی' کے نام پر 'جبر مسلسل' کا شکار ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کانٹ کا 'ارادے کی خود مختاری' (Autonomy of Will) کا دعویٰ عملاً 'خواہش کی خود مختاری' پر ختم ہوا۔ جب انسان نے خدا کی بندگی سے منہ موڑ کر اپنی عقل کو خواہشات کی تکمیل کا آلہ بنایا، تو وہ خواہشات ارادے سے آزاد ہو کر خود 'مقتدر' بن گئیں۔ آج کا جدید انسان آزاد نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے ہی بدن میں موجود ان خواہشات کا قیدی ہے جن کا اپنا ایک ارادہ اور اپنی ایک منطق ہے۔ یہ وہی 'ہوائے نفس' ہے جس کے بارے میں قرآن نے متنبہ کیا تھا کہ یہ انسان کو علم کے باوجود گمراہ کر دیتی ہے (أَضَلَّهُ اللهُ عَلَىٰ عِلْمٍ)۔ سرمایہ دارانہ نظام دراصل اسی 'غیر ارادی خواہش' کو ایک عالمگیر طاقت میں بدلنے کا نام ہے۔

معاشرے کی دو سطحی تشریح یہاں بھی لاگو ہوتی ہے۔ معاشرے کی اکثریت پر خواہشات جس سطح پر حکمران ہوتی ہیں وہ لہو و لعب اور خورد و نوش اور اس سے متعلقہ خواہشات کی سطح ہوتی ہے۔ عوام اپنی جبلتوں کے اسیر ہو کر نظام کے لیے 'صارف' (Consumer) کا کام

دیتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک چھوٹی سی اقلیت خواہشات کی اسیر مجرد سطح پر ہوتی ہے جہاں خواہش بڑھوتری برائے بڑھوتری کی عمومی خواہش ہوتی ہے۔ اس سطح پہ خواہش تعمیم اور تجرید کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ اقلیت کسی ایک چیز کی نہیں بلکہ 'لامحدود اضافے' کی اسیر ہوتی ہے۔ ان کے لیے دولت لذت کا ذریعہ نہیں بلکہ 'طاقت اور تجرید' کا ایک نظام ہے۔ یہ چھوٹی سی اقلیت سرمایہ دارانہ تعقل کی تجسیم ہوتی ہے اور اسی بنا پر ان کو معاشرتی اور ریاستی سطح پہ رسمی اور غیر رسمی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی اقلیت کانٹ کے اس 'مشرع' (Legislator) کی عملی شکل ہے جو عقلِ مجرد کو استعمال کر کے نظام چلاتی ہے۔ چونکہ ان کی خواہش 'تعمیم' (Generalisation) اور 'تجرید' (Abstraction) کی شکل اختیار کر چکی ہوتی ہے، اس لیے وہ خود کو 'عقلمند' اور 'اصول پسند' سمجھتے ہیں۔ اسی 'مجرد عقلیت' کی بنا پر انہیں ریاست اور معاشرے میں وہ مقام حاصل ہوتا ہے جہاں وہ قانون سازی کرتے ہیں اور عوام کو 'آئیڈیلز' فراہم کرتے ہیں۔ وہ نظام کی روح (Spirit of the System) بن جاتے ہیں۔

کانٹ کی آزادی کا انجام ایک ایسے دو سطحی جبر پر ہوا جہاں ایک طرف عوام حیوانی لذتوں (لہو ولعب) کے اسیر ہیں اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی اقلیت 'بڑھوتری کی مجرد خواہش' کی غلام ہے۔ یہ اشرافیہ خود کو آزاد سمجھتی ہے کیونکہ وہ 'عقل' کے ذریعے نظام چلاتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ بھی اسی 'غیر ارادی منطق' کی اسیر ہے جس نے 'اضافے' کو ہی اپنا خدا بنا لیا ہے۔ یہ 'سرمایہ دارانہ تعقل' دراصل اس 'ہوائے نفس' کی معراج ہے جو 'علم' کے لبادے میں انسان کو ہدایت سے دور لے جاتی ہے۔ اسلامی انقلاب کا مقصد اس مادی اور مجرد اسارت سے نجات دلا کر انسان کو اس کے اصل خالق کی بندگی میں لانا ہے جہاں عقل 'بڑھوتری' کی نہیں بلکہ 'حق' کی خادم ہو۔

سرمایہ داری جب اپنی ابتدائی صنعتی شکل (Industrial Capitalism) میں تھی، تو

وہ پھر بھی کسی حد تک "مادی اشیاء" سے جڑی ہوئی تھی۔ لیکن جوں جوں یہ نظام "میچور" (Mature) ہوا، اس نے مادی حقیقت کو پیچھے چھوڑ کر 'فائنانس' کی صورت اختیار کر لی۔ فائنانس کیپٹل "بڑھوتری برائے بڑھوتری" کی خالص ترین تجریدی شکل ہے۔ یہاں دولت کا تعلق بنیادی طور پر کسی پیداوار سے نہیں بلکہ اعداد و شمار کی ہیر پھیر اور 'کریڈٹ' سے ہے۔ یہ کانٹ کی اس عقلِ مجرد کی تجسیم ہے جس کا مادی دنیا (Phenomena) سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

آج فائنانس اور بگ ٹیک ایک ہی سکے کے دو رخ بن چکے ہیں۔ بگ ٹیک عوام کی "حیوانی خواہشات" (لہو و لعب) کو ڈیٹا کی صورت میں محفوظ کرتا ہے اور الگورتھمز کے ذریعے ان خواہشات کو مہمیز دیتا ہے۔ یہ دونوں مل کر ایک ایسا عالمی ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں جہاں مٹھی بھر تجریدی اشرافیہ (Technocrats) پوری انسانیت کے ارادے پر حاوی ہے۔ پالیسی سازی کسی اخلاقی قدر پر نہیں، بلکہ "ڈیٹا کی بڑھوتری" اور "مالیاتی منافع" کی منطق پر ہوتی ہے۔ فرد سمجھتا ہے کہ وہ انٹرنیٹ پر 'آزاد' ہے، لیکن وہ درحقیقت ایک ایسے ڈیجیٹل جال میں قید ہے جو اس کی خواہشات کو اور اس کے ارادے کو استعمال کر رہا ہے۔ یہ کانٹ کے "مشرعِ خود مختار" کا وہ عبرتناک انجام ہے جہاں انسان اپنی ہی بنائی ہوئی تجریدی مشینوں (Algorithms) کا غلام بن گیا ہے۔

کانٹ کی عقلِ مجرد کا سفر آج فائنانس اور بگ ٹیک کے عالمی استبداد پر آ کر ختم ہوا ہے۔ جہاں مادی پیداوار کی جگہ 'اعداد' نے اور انسانی ارادے کی جگہ 'الگورتھمز' نے لے لی ہے۔ یہ 'بڑھوتری برائے بڑھوتری' کی وہ منطق ہے جس نے زمین کے وسائل سے لے کر انسانی قلب کی گہرائیوں تک ہر چیز کو اپنی تجریدی اسارت میں لے لیا ہے۔

خواہشات کی اس تجریدیت کا اظہار انتہا پسند ڈسٹوپیا کی شکل میں ہوتا ہے جہاں اے آئی اور مشین لرننگ سے وابستہ افراد اور بگ ٹیک کا ائتلاف ایک ایسے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتا ہے جہاں انسانوں کی جگہ روبوٹ لے لیں گے اور بڑھوتری برائے بڑھوتری کا

آلۂ کار ہوں گے اور اس میں ان لوگوں کی کوئی جگہ نہیں ہو گی جو اپنے آپ کو اس پاگل پن سے سو فیصد وابستہ نہ کر لیں۔ یہ لوگ اس پر راضی ہیں کہ انسانوں کی اکثریت نابود ہو جائے اور صرف روبوٹ اور وہ چھوٹی سی اقلیت باقی رہے جو خواہشات کی اور خاص طور پر بڑھوتری برائے بڑھوتری کی خواہش کی سو فیصد غلام بن چکی ہو۔

ہمارا یہ تجزیہ کانٹ کے فلسفے سے شروع ہونے والے سفر کے اس منطقی اور بھیانک انجام کی نشاندہی کرتا ہے جسے "مابعد انسانیت" (Post-humanism) یا ایک "تکنیکی ڈسٹوپیا" (Technological Dystopia) کہا جاتا ہے۔ نک لینڈ (Nick Land) جیسے مفکرین جس 'ایکسلریشن ازم' (Accelerationism) کی بات کرتے ہیں، وہ دراصل کانٹ کی اس 'مجرد عقل' کی آخری حد ہے جہاں عقل خود انسان کو ایک 'رکاوٹ' سمجھ کر اسے راستے سے ہٹا دینا چاہتی ہے۔

کانٹ کی 'خود مختار عقل' کا سفر آج نک لینڈ کے 'تکنیکی جنون' پر آ کر ختم ہوا ہے۔ جس آزادی کا آغاز لوتھر نے بندگیِ رب سے بغاوت کے ذریعے کیا تھا، اس کا انجام انسان کی اپنی 'نابودگی' (Extinction) پر ہو رہا ہے۔ یہ وہ ڈسٹوپیا ہے جہاں 'بڑھوتری برائے بڑھوتری' کی تجریدی خواہش انسان کو کھا چکی ہے اور اب وہ صرف ان روبوٹس اور مٹھی بھر 'مشینی انسانوں' کا مستقبل چاہتی ہے جو اس جنون کے سو فیصد اسیر ہوں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کو قرآن کی اس پکار کی ضرورت ہے: 'فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ' (تم کدھر جا رہے ہو؟)۔ اسلامی انقلاب کا موجودہ دور میں سب سے بڑا معرکہ اس 'انسانیت دشمن' تکنیکی جبر کے خلاف ہے، تاکہ عقل کو دوبارہ اس کے اصل مرکز 'وحی' سے جوڑ کر انسان کو اس کے منصبِ خلافت پر بحال کیا جا سکے اور اسے اس مشینی جہنم سے بچایا جا سکے جسے وہ اپنی جنت سمجھ رہا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ

عَلَى الْأَفْئِدَةِ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ

ترجمہ: تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو منہ پر عیب جوئی کرنے والا اور پیٹھ پیچھے طعنہ دینے والا ہو۔ جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اُسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ہر گز نہیں! وہ ضرور ایک توڑ پھوڑ کر رکھ دینے والی چیز میں پھینک دیا جائے گا، اور تم کیا جانو کہ وہ توڑ پھوڑ کر رکھ دینے والی چیز کیا ہے؟ وہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے، جو دلوں تک پہنچ جائے گی۔ یقیناً وہ اُن پر بند کر دی جائے گی، لمبی لمبی ستونوں میں۔

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرُود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصُود ہے!

## نوٹس

۱۔جدید ہیومنزم کی داستان لوتھر سے پہلے شروع ہوتی ہے۔

رینیساں ہیومنزم: چودھویں صدی میں اٹلی میں شروع ہونے والی یہ تحریک، کلاسیکی یونانی اور لاطینی ادب (خاص طور پر Ciceronian) کے مطالعہ کے ذریعے انسانی صلاحیت، کامیابی، اور تعلیم پر زور دیتی تھی۔ یہ دنیوی زندگی (Secular Life) کی قدر و قیمت کو اجاگر کرتی تھی اور قدیم چرچ کی تعلیمات کی یکطرفہ مرکزیت کو چیلنج کرتی تھی۔ لوتھر کی تحریک (سولھویں صدی کی) مذہبی اصلاح کی تحریک تھی، جس کا نتیجہ اگرچہ انفرادیت پرستی کی شکل میں سامنے آیا، لیکن یہ بنیادی طور پر ایک مذہبی بغاوت تھی۔ جبکہ ہیومنزم ایک نظریاتی اور ثقافتی بغاوت تھی جو لوتھر سے بہت پہلے انسانی ریزن اور ارادے کو فوقیت دے چکی تھی۔

۲۔لوتھر کا "Priesthood of all believers" اور ڈیکارٹ کا "Cogito, ergo sum" (میں سوچتا ہوں، پس میں ہوں) دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں: لوتھر نے مذہبی سطح پر واسطے کو (Mediation) ختم کر کے فرد کو عقلِ محض کے ذریعے بائبل کی تعبیر کا حق دیا، جس نے روایتی مقتدرہ (Authority) کو منہدم کیا۔ علمی سطح پر ڈیکارٹ نے شک کے ذریعے تمام سابقہ روایات کو رد کر کے علم کی بنیاد "ذات" پر رکھی۔ ان دونوں نے مل کر اس 'خود مختار فرد' کی تخلیق کی جو اب اپنی نجات اور اپنے سچ کا خود ذمہ دار تھا۔

۳۔متن میں جن دو نظریات کا ذکر کیا گیا ہے، انہیں فلسفیانہ اصطلاح میں درج ذیل عنوانات سے منسوب کیا جاسکتا ہے:

ارادیت پسندی (Voluntarism): اس کے مطابق "خیر" وہ ہے جس کا ارادہ خدا نے کیا۔ اگر خدا جھوٹ کو خیر قرار دے دیتا تو وہ خیر بن جاتا۔ یہاں اخلاقیات مکمل طور پر اطاعت (Obedience) پر مبنی ہیں۔ عیسائیوں میں سینٹ آگسٹین اور مسلمانوں میں اشاعرہ اسی رخ پر تھے۔

اخلاقی واقعیت (moral realism): جیسا کہ تھامس اکوائنس اور معتزلہ کا موقف تھا کہ اشیاء میں حسن و قبح (اچھائی اور برائی) ذاتی طور پر موجود ہے جسے عقل پہچان سکتی ہے۔ یہاں خدا کا حکم عقل کے تابع یا اس کے موافق ہوتا ہے۔

۴۔ کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کی بنیاد خالص عملی ریزن (pure practical reason) ہے۔ خالص ریزن سے مراد یہ ہے کہ اخلاقیات کی بنیاد حواس خمسہ یا تجربہ نہیں ہو سکتے۔ عملی سے مراد یہ ہے کہ اس عقل کا تعلق ارادے اور آزادی سے ہے۔ لیکن یہ ارادہ خالص عقلی (ریشنل) ارادہ ہے جس میں احساسات حواس اور تجربہ شامل نہیں ہیں۔ کانٹ کا مشہور شارح لوئیس وائٹ بیک لکھتا ہے:

...pure practical reason, [is] the source of its own law, is autonomous or self legislating in a way in which an empirically conditioned practical reason could not be.

ترجمہ: خالص عملی ریزن چونکہ اپنے قانون کی خود منبع ہے، اس لیے وہ جس معنی میں خود مختار اور خود قانون ساز ہے اس معنی میں تجربے اور میلانِ طبعی سے مشروط عملی ریزن کبھی بھی خود مختار و خود قانون ساز نہیں ہو سکتی۔

اس عبارت کا لبِ لباب یہ ہے کہ اگر ہماری ریزن / عقل بیرونی عوامل (جیسے جذبات، خواہشات، یا سماجی مفادات) سے متاثر ہو کر کوئی فیصلہ کرتی ہے، تو وہ 'آزاد' نہیں رہتی۔ بیک کی یہ عبارت کانٹ کے فلسفۂ اخلاق کے اس نکتے کی وضاحت کرتی ہے جہاں 'عقلِ محض' اور 'فطرت' کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا جاتا ہے۔ یہ تصور خود مختاری (Autonomy) اور ہیٹرونومی (Heteronomy) کا فرق واضح کرنے کے حوالہ سے کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

بیک یہاں کانٹ کے دو طرح کے 'عملی ارادوں' کے درمیان فرق کر رہا ہے:

ا۔ عقلِ عملی محض بمقابلہ تجرباتی عقل (Pure vs. Empirical Reason)

- تجرباتی طور پر مشروط عقل: یہ وہ عقل ہے جو 'اگر اور مگر' کے تابع ہے۔ مثلاً: "اگر میں سچ بولوں گا تو میری ساکھ بہتر ہو گی۔" یہاں عقل آزاد نہیں ہے بلکہ 'ساکھ' (ایک تجرباتی مفاد) کی غلام ہے۔ کانٹ کے نزدیک یہ ہیٹرونومی ہے۔
- خالص عقلِ عملی: یہ وہ مقام ہے جہاں عقل کسی بھی خارجی نتیجے یا مادی فائدے سے قطعِ نظر، صرف اپنے اندر موجود 'اخلاقی قانون' کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہے۔ یہ کسی دوسرے قانون کی محتاج نہیں بلکہ خود اپنا قانون (Source of its own law) ہے۔

۲۔ خود تشریعت (Self-legislation) کا انقلابی پہلو: بیک کے الفاظ میں "Autonomous or Self-legislating" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقی قانون انسان پر باہر سے مسلط نہیں کیا گیا (چاہے وہ معاشرہ ہو یا مذہب کی روایتی تعبیر)، بلکہ یہ انسان کی اپنی 'عقلِ محض' کا جوہر ہے۔

ہماری بحث کے تناظر میں اس کے دو بڑے نتائج نکلتے ہیں:

ا۔ خارجی اتھارٹی کی نفی: اگر عقل خود قانون ساز ہے، تو کسی بھی ایسی اطاعت کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے جو عقل کے اس داخلی قانون سے متصادم ہو۔ یہی وہ "خدا کے خلاف بغاوت" کا فلسفیانہ نکتہ ہے جس کا ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا۔

۲۔ انسانی کرامت: انسان کی عزتِ نفس اس بات میں ہے کہ وہ اپنے ہی دیے ہوئے قانون کا تابع ہے، نہ کہ کسی مادی ضرورت یا خوف کا۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ: کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کا اصل امتحان یہ ہے کہ کیا ارادہ 'خالص عقل' سے پھوٹ رہا ہے یا 'تجرباتی محرکات' سے۔ لیوس وائٹ بیک واضح کرتا ہے کہ خود مختاری (Autonomy) کا تقاضا یہ ہے کہ عقل خود اپنی شارع ہو۔ اگر عقل فطرت (چاہے وہ درونی ہو یا بیرونی) کے حالات (Empirical conditions) کے تابع ہو کر فیصلہ کرے گی، تو وہ خود مختار نہیں رہے گی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کانٹ 'انسان' کو کائنات (چاہے وہ فطرت ہو چاہے وہ معاشرت) کے "جبر" سے نکال کر ایک مابعد الطبیعیاتی 'شارع' کے منصب پر فائز کر دیتا ہے۔

۵۔ یہ درست ہے کہ کانٹ کے نزدیک انسان خداؤں کے کنبے کا فرد ہے لیکن انسان اور اس کنبے کے دوسرے افراد میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ انسان نامکمل خدا ہے۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے انسان اور اس کنبے کے دوسرے افراد کے درمیان اخلاقیات کے قانون کے ضمن میں چند اہم فرق ابھرتے ہیں جو ملحوظ رہنے چاہییں۔ اس فرق کو بیان کرتے ہوئے وائٹ بیک لکھتا ہے:

A purely rational being acts only on maxims that he would will to be maxims for all rational beings, i.e; only on maxims that could be willed to be principles universally binding on all such beings. For men, who are not completely rational, this is expressed in the categorical imperative: "So act that the maxims of your will could always hold at the same time as the principal for giving universal law".

ترجمہ: ایک خالص عقلی وجود صرف ان اصولوں پر عمل کرتا ہے جنہیں وہ تمام عقلی وجودوں کے لیے قانونِ آفاقی کے طور پر واجب العمل تسلیم کر سکے۔ چونکہ انسان مکمل طور پر ریشنل نہیں ہے، اس لیے اس کے لیے یہ قانون ایک 'امر مطلق' بن جاتا ہے: یعنی اپنے ارادے کو ہمیشہ اس طرح بروئے کار لاؤ کہ تمہارا اصولِ

عمل بیک وقت آفاقی قانون سازی کا ذریعہ بن سکے۔ بیک کے مطابق، کانٹ کے ہاں کامل ریشنل ہستی perfectly (purely) rational being وہ ہستی ہے جس کی ارادی ساخت مکمل طور پر خالص عقلِ عملی کے تابع ہو۔

ایسی ہستی صرف اُن عملی قواعد (maxims) پر عمل کرے گی جو بلا تناقض آفاقی قانون کے طور پر چاہے جا سکیں اور جن کی آفاقیت اس کی فطری عقلی ماہیت کا لازمی اظہار ہو۔

ایسی ہستی کے لیے اخلاقی قانون کوئی پابندی (constraint) نہیں، کوئی فریضہ (duty) نہیں، بلکہ اس کی عقلی ماہیت کی توصیف (description) ہے یہاں قانون اور ارادہ میں کوئی کشمکش نہیں ہوتی۔ ریزن جو حکم دیتی ہے، وہی ارادہ ہے۔

الغرض بیک کے مطابق، ایک Perfectly Rational Being (جیسے خدا یا فرشتے) کے لیے اخلاقی قانون کوئی 'حکم' یا 'بوجھ' نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی فطرت کا بیان ہے۔ اس وجود کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ غیر عقلی عمل کرے۔ یہاں اخلاقیات "تجویزی" (Prescriptive) نہیں رہتی بلکہ "توصیفی" (Descriptive) ہو جاتی ہے۔ یعنی اس وجود کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ وہی کرے گا جو آفاقی طور پر درست ہے۔

اس کے برعکس، کانٹ کے نزدیک انسان غیر کامل ریشنل ہستی imperfectly rational being ہے — یعنی اس میں ریزن کے ساتھ میلان، خواہشات اور میلانِ طبعی بھی موجود ہیں۔ لہٰذا انسان کو صرف اُن عملی قواعد (maxims) پر عمل کرنا چاہیے جو آفاقی قانون بن سکیں اور یہ عمل "محض احترامِ قانون" (reverence for the moral law) کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

بیک کی تشریح کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ غیر اخلاقی عمل کو غیر عقلی (Irrational) قرار دیتا ہے۔ کانٹ کے نزدیک اگر میں جھوٹ بولتا ہوں، تو میں ایک ایسا قانون بنانا چاہ رہا ہوں جو 'آفاقی' نہیں ہو سکتا (کیونکہ اگر سب جھوٹ بولیں تو 'سچ' اور 'اعتبار' کا تصور ہی ختم ہو جائے گا)۔ لہٰذا، گناہ یا بدی دراصل عقلی تضاد (Logical Contradiction) کا نام ہے۔ یہی کانٹ کا Categorical Imperative ہے۔

یہاں اخلاقی قانون فطری اظہار نہیں بلکہ ایک امری تقاضا (imperative demand) ہے، کیونکہ انسان میں عقل اور میلان کے درمیان ممکنہ تصادم موجود ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ انسان کے نفس عقلی کا اس کے نفس حیوانی کو حکم اور اس کے نفس علوی کا اس کے نفس سفلی سے تقاضا ہے۔ الغرض انسان چونکہ ایک Imperfectly Rational Being ہے (کیونکہ اس کے پاس جذبات، خواہشات اور جسمانی تقاضے بھی ہیں)، اس لیے اس کے لیے اخلاقی قانون ایک 'حکم' (Imperative) بن کر آتا ہے۔ انسان کو اپنی خواہش (Inclination) کو عقل کے تابع کرنے کے لیے "جدوجہد" کرنی پڑتی ہے۔

اسی لیے انسان کے لیے اخلاقیات کا جوہر Reverence (عظمت/احترام قانون) اور Duty (فرض) ہے۔ لیکن یہ اس قانون کی تعظیم ہے جس کا شارع بطور خالص عقل وہ خود ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اس کی اپنے نفس علوی کی تعظیم و تبجیل ہے۔

۶۔کانٹ کا تصور اخلاقیات اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان کا عقلی ارادہ قوانین فطرت سے باہر ہو۔ کانٹ انسان کو ان معنوں میں آزاد سمجھتا ہے اور آزادی ان معنوں میں کانٹ کے تصورِ اخلاقیات کی ضروری شرط ہے۔ لیکن کانٹ کے نزدیک اس آزادی کا ثبوت خود اخلاقی قانون ہے۔ وائٹ بیک اس سلسلے میں لکھتا ہے:

...the concept of freedom and that of universal practical law reciprocally imply each other. We are not directly aware of freedom, but we are directly aware of the binding quality of a universal law, for we have it presented to us in our consciousness of the moral law. The moral law thus leads us inevitably to assert the existence of freedom; it is the ratio cognoscendi of freedom while freedom is the ratio essendi of the moral law.

ترجمہ: آزادی کا تصور اور آفاقی عملی قانون کا تصور باہم ایک دوسرے کو مستلزم ہیں۔ ہمیں آزادی کا براہِ راست شعور نہیں ہوتا، بلکہ ہمیں جس چیز کا فوری شعور حاصل ہے وہ ایک آفاقی قانون کی لازمیت ہے، کیونکہ یہ اخلاقی قانون کی صورت میں ہمارے شعور میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح اخلاقی قانون ہمیں ناگزیر طور پر آزادی کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور کرتا ہے؛ اخلاقی قانون آزادی کے علم کا ذریعہ ہے، جبکہ آزادی اخلاقی قانون کے وجود کی بنیاد ہے۔

بیک کی یہ وضاحت کانٹ کے نظامِ فکر کی اس 'منطقی مثلث' کو مکمل کرتی ہے جس پر اس کی پوری مابعد الطبیعیات کھڑی ہے۔ یہاں کانٹ اپنے تئیں ایک بہت بڑے علمی مخمصے کا حل پیش کرتا ہے: "اگر ہم مادی دنیا میں علت و معلول (Cause and Effect) کے پابند ہیں، تو ہمیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم آزاد بھی ہیں؟"

کانٹ کا دعویٰ ہے کہ آزادی اور آفاقی اخلاقی قانون ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اگر آپ آزاد نہیں ہیں، تو اخلاقیات کا کوئی معنی نہیں۔ اگر اخلاقی قانون موجود نہیں، تو آزادی محض ایک بے لگام خواہش ہے۔

بیک نے یہاں دو لاطینی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو کانٹ کے استدلال کی روح ہیں:

دریافت کی بنیاد: ہمیں اپنی آزادی کا براہِ راست علم نہیں ہوتا (ہم اسے دیکھ یا چھو نہیں سکتے)۔ لیکن جب ہم اپنے اندر ایک 'اخلاقی فرض' محسوس کرتے ہیں، تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ "چونکہ مجھے یہ کرنا چاہیے، اس کا مطلب ہے کہ میں یہ کرنے کی طاقت (آزادی) بھی رکھتا ہوں"۔ پس، اخلاقی قانون ہمیں آزادی کی پہچان کرواتا ہے۔

وجود کی بنیاد: اگر حقیقت میں انسانی ارادہ آزاد نہ ہوتا، تو اخلاقی قانون سرے سے وجود ہی نہ رکھتا۔ آزادی وہ

بنیاد ہے جس پر اخلاقیات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

## حوالہ جات


Beck, Lewis White. (1960). *A Commentary on Kant's Critique of Practical Reason*. University of Chicago Press.

Deleuze, Gilles & Guattari, Félix. (1972). *Anti-Oedipus: Capitalism and Schizophrenia*. University of Minnesota Press.

Kant, Immanuel. (1785). *Groundwork of the Metaphysics of Morals.* (Translator Mary Gregor) Cambridge University Press.

Kant, Immanuel. (1788). *Critique of Practical Reason*. (Translation & editing: Lewis White Bec) Macmillan Publishing Company (1993 edition).

Kuehn, Manfred. (2001). *Kant: A Biography*. Cambridge University Press.

Land, Nick. (2011). *Fanged Noumena: Collected Writings 1987–2007.* Urbanomic.

Schneewind, J. B. (1998). *The Invention of Autonomy: A History of Modern Moral Philosophy*. Cambridge University Press.

Tawney, R. H. (1926). *Religion and the Rise of Capitalism*. Harcourt, Brace and Company.

# جرمنی میں لبرل ڈیموکریٹک نظم کی تحلیل

جاوید اکبر انصاری

امریکا کے بعد جرمنی عالمی سرمایہ دارانہ سامراجی نظام کو سہارا دینے والی سب سے اہم قوت ہے۔ یہ یورپی سامراج کی سرخیل قوت ہے اور اسرائیل کی کلیدی حلیف ہے۔ یہ یورپ کی سب سے بڑی معیشت ہے اور یورپی تنویری اور رومانوی فکر کی تخلیق اور ترویج میں جرمنی کا کردار ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ آج پوری دنیا کی طرح جرمنی میں بھی لبرل ڈیموکریٹک نظم ریاست شکست وریخت کا شکار ہے۔ یہ مضمون جرمنی میں لبرل جمہوری نظاماتی عمل کی بتدریج تحلیل کا ایک جائزہ پیش کرتا ہے۔

## تاریخی پس منظر

انیسویں صدی تک موجودہ جرمنی کئی آزاد رجواڑوں میں منقسم تھا جس کو ہوہنزولرن Hohenzollern خاندان نے اپنی ریاست پروشیا(Prussia) کے تحت متحد کیا۔ اس نئی ریاست کا سب سے اہم قائد بسمارک(Otto von Bismarck) تھا جس نے ایک ایسا استبدادی نظم قائم کیا جس میں کئی سوشل ڈیموکریٹک حقوق اور مراعات فراہم کی گئیں تھیں۔ پروشیا کی ریاست نے تیزی سے اپنی قوت میں اضافہ کیا اور ۱۸۸۰ء کی دہائی تک سامراجی لوٹ مار میں بڑے پیمانے پر شامل ہونے کے قابل ہو گئی جو پہلی جنگ عظیم پر منتج ہوا۔

جب پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی تو جنگ کے فاتحین (برطانیہ، فرانس اور امریکا) نے ہوہنزولرن خاندان کی بادشاہت کا خاتمہ کر کے لبرل ڈیموکریٹک نظم ریاست مسلط کیا۔ یہ نظام جس کو وایمر ریپبلک(Weimar republic) کہتے ہیں ۱۹۱۸ء میں قائم ہوا لیکن ۱۹۱۹ء میں سپارٹیکس تحریک(Spartacist movement) کے ذریعے سوویت یونین کے طرز کی اشتراکی سرمایہ دارانہ ریاست قائم کرنے کی کوشش کی گئی جس کو

کچلنے کے لیے مقامی لبرلوں کو پھر فرانس، برطانیہ اور امریکا کا سہارا لینا پڑا۔

وایمر ریپبلک ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۳ء تک قائم رہی لیکن لبرل جمہوری نظم ریاست مستحکم نہ ہو سکا اور ۱۹۲۶ء کے بعد سے فاشسٹ تحریک بتدریج عوامی پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے جمہوری دستوری عمل کے ذریعے ہی ریاست پر قبضہ حاصل کر لیا۔

۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء تک فاشسٹ اقتدار قائم رہا۔ یہ ایک استبدادی جمہوری نظام تھا جس میں بہت سے لبرل جمہوری حقوق تو معطل تھے لیکن بسمارک کے کئی سوشل ڈیموکریٹک حقوق اور مراعات عوام کو فراہم کیے گئے۔ فاشسٹ حکومت کو عوام کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور اس کی جرمنی کی سرحدوں کو وسیع کرنے کی پالیسی نہایت مقبول تھی۔ اس پالیسی کے تحت ۱۹۳۹ء تک جرمنی نے کئی مغربی ممالک کو فتح کر لیا اور اپنی سامراجی فتوحات کو افریقہ میں توسیع دی۔ اسی دور میں یورپ کی دیگر فاشسٹ ریاستیں (اٹلی، اسپین اور پرتگال) جرمنی کی حلیف بنی رہیں۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی جس کے خاتمے پر امریکا اور سوویت یونین نے جرمنی پر قبضہ کر لیا۔ جرمن ریاست دوبارہ تقسیم ہو گئی اور فاتحین (امریکا اور سوویت یونین) نے اپنی مرضی کے مطابق اپنے اپنے مقبوضہ علاقے میں اپنا ریاستی نظام مسلط کیا۔ مشرقی جرمنی میں استبدادی جمہوری نظام مسلط کیا گیا اور ۱۹۴۶-۱۹۴۵ میں امریکی فوج کے زیر تسلط لبرل جمہوری نظام مغربی جرمنی پر مسلط کیا گیا۔ ۱۹۸۹ء میں مشرقی جرمنی کا سقوط عمل میں آیا اور جرمنی کو ایک لبرل جمہوری نظام کے تحت متحد کر دیا گیا۔

## دور حاضر کی جرمن ریاست

جرمن ریاستی نظام کبھی بھی محفوظ نہیں رہا ہے۔ متحدہ جرمنی میں شامل علاقوں کی تقریباً دو سو سالہ تاریخ میں لبرل جمہوریت کے غلبہ کا دور محدود رہا ہے اور جرمن عوام کا ایک معتد بہ حصہ کبھی بھی لبرل اقدار کو اپنا (internalise) نہ سکا۔ یہ الگ بات ہے کہ قانونی

پابندیوں کی وجہ سے فاشسٹ حامی بہت عرصے تک زیر زمین جانے پر مجبور ہو گئے۔

فاشسٹوں کی حالیہ نمایندہ سیاسی جماعت AfD اے ایف ڈی (alternative für deutschland) ہے جو کہ لبرل ڈیموکریٹس کے سامنے بڑا چیلنج پیش کر رہی ہے اور جس نے دائیں بازو کی جماعت کرسچن ڈیموکریٹک یونین (CDU) اور اس کی حلیف کرسچن یونین آف بویریا (CSU) کو کمزور کر دیا ہے۔ اے ایف ڈی ایک نسل پرست تنظیم ہے جو جرمنی میں لاکھوں تارکین وطن کے لبرل ڈیموکریٹک حقوق کو سلب کر کے ان کو ملک سے نکالنے کی وکالت کرتی ہے۔ تارکین وطن کے خلاف نفرت جرمن عوام میں بہت تیزی سے پھیل رہی ہے اور ۲۰۲۵ء کے انتخابات میں تارکین کے ضمن میں اختیار کی گئی پالیسی سب سے اہم ایشو تھا۔ جرمن عوام کی نظر میں تارکین سے سلوک جرمنی میں بڑھتی ہوئی معاشی ابتری اور ریاستی ماحولیاتی بحران سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اے ایف ڈی یورپی یونین کے ان قوانین کی شدت سے مخالفت کرتی ہے جو تارکین کے لبرل جمہوری حقوق کا کسی نہ کسی حد تک تحفظ کرتے ہیں۔

اے ایف ڈی کا اصل مقصد لبرل جمہوری نظام کی تسخیر اور اس کی جگہ ایک نسل پرست فاشسٹ ریاستی نظام کا احیاء ہے۔ وہ سوشل ڈیموکریٹک اقدامات کی مخالفت نہیں کرتی اور اس سے بائیں بازو کی جماعت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اے ایف ڈی کا اصل ہدف دائیں بزو کی جماعتیں ہیں جو اس کے دباؤ کے تحت اے ایف ڈی کی وضع کردہ پالیسیاں اختیار کر رہی ہیں۔ ۲۰۲۴ء میں حالیہ چانسلر کی حمایت یافتہ چند جماعتوں نے تارکین کے ضمن میں ایک ایسا بیانیہ پارلیمنٹ میں منظور کروایا جو اے ایف ڈی کے موقف سے ہم آہنگ ہے اور جس کی اے ایف ڈی کے نمائندوں نے حمایت کی۔

## ۲۰۲۵ء کے انتخابات

جدول نمبر ایک میں جرمنی کے تین انتخابات میں پارٹیوں کے عمومی ووٹوں کے حاصل شدہ تناسب کو پیش کیا گیا ہے۔ اس تناسب کے مطابق پارلیمنٹ میں سیٹوں کی تقسیم کی جاتی ہے۔

جدول ایک: جرمن انتخابات میں مجموعی ووٹوں کا حاصل شدہ تناسب فیصد میں

| پارٹیاں | ۲۰۱۷ | ۲۰۲۱ | ۲۰۲۵ |
|---|---|---|---|
| دہندگان کا تناسب | ۷۶٫۲۹ | ۷۶٫۶ | ۸۲٫۵ |
| CDU-CSU | ۳۲٫۹ | ۲۴٫۱ | ۲۸٫۶ |
| SPD | ۲۰٫۵ | ۲۵٫۷ | ۱۶٫۴ |
| The Greens | ۸٫۹ | ۱۴٫۰ | ۱۱٫۶ |
| FDP | ۱۰٫۷ | ۱۱٫۳ | ۴٫۳ |
| AfD | ۱۲٫۶ | ۱۰٫۴ | ۲۰٫۸ |
| Left Party | ۹٫۷ | ۹٫۹ | ۸٫۸ |
| BSW | ۰ | ۰ | ۴٫۹۷ |

انتخابات سے قبل تین جماعتوں CSD/CSU, SPD اور گرینز (Greens) کی حکومت قائم تھی۔ ۲۰۲۵ء کے انتخابات میں اس اتحاد کو مجموعی رائے دہندگان کے ۸٪ فیصد کم ووٹ ملے۔ CDU/CSU کے ووٹوں میں اضافہ ہوا لیکن وہ اکیلے حکومت بنانے کے قابل نہ ہوئی۔ اور اس کو شکست خوردہ SPD کے ساتھ اشتراک کرنا پڑا۔

اس اتحاد کو AfD کو حکومت سے باہر رکھنے کے لیے بنایا گیا کیونکہ جرمنی کی تمام لبرل جماعتوں نے AfD سے اتحاد نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ انتخاب میں واضح کامیابی دو فریقوں نے حاصل کی۔ AfD اور بائیں بازو کی جماعتیں۔ بائیں بازو کی جماعتوں لنکس اور BSW کا مشترکہ ووٹ ۲۰۱۱ء کے مقابلہ میں ۹ء۴ فیصد سے بڑھ کر ۶ء۱۳ فیصد ہو گیا۔

AfD کے ووٹ کا تناسب ۲۰۲۱ء کے مقابلہ میں دوگنا سے بھی زیادہ بڑھا۔ وہ اب جرمن پارلیمنٹ کی دوسری سب سے بڑی جماعت ہے اور اس کی کامیابی کا ایک سبب رائے دہندگان کی شرح میں حیرت انگیز اضافہ بھی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بہت سے شہری جو پہلے ووٹ نہ دیتے تھے اب AfD کے حمایتی بن گئے ہیں۔ یہ انتخابات جرمنی کی

روایتی لبرل جماعتوں کے انحطاط اور لبرل نظم اجتماعی کی تحلیل کی نشان دہی کرتے ہیں اور امریکا کی طرح جرمن عوام بھی لبرل جمہوریت سے مایوس اور اس کے انتہا پسند دائیں بازو اور بائیں بازو کے مخالفین کی حمایتی بنتے جارہے ہیں۔ AfD اور بائیں بازو کی جماعتوں نے انتخابی عمل کے غیر شفاف ہونے کا الزام الیکشن اتھارٹی پر پہلی مرتبہ لگایا ہے۔ لبرل نظام کی بڑھتی ہوئی کمزوری کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ CSD اور SPD میں اتحاد ٹرمپ کے دباؤ کے تحت قائم کیا گیا۔

امریکا اور دیگر مغربی یورپی ممالک کی طرح جرمنی بھی معاشی اور سماجی ابتری کا شکار ہے۔ مجموعی پیداوار کی شرح نمو گر رہی ہے، آبادی گر رہی ہے اور اس میں بوڑھوں کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ ماحولیاتی کثافت میں اضافہ شکست خوردہ معاشی ڈھانچہ، روس سے بڑھتی ہوئی کشمکش اور امریکی خارجہ پالیسیوں سے پیدا ہونے والے خدشات، یہ سب عوامل عوام میں لبرل نظام کی کارفرمائی سے مایوسیاں پیدا کر رہے ہیں۔

جرمنی کا موجودہ دستور (Grundgesetz) جرمن حکومت کی بہت سی ایسی اصلاحات کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے جنہیں مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے حکومت ضروری سمجھتی ہے۔ دستور میں ترمیمات کی ضرورت ہے اور یہ ترمیمات AfD کی اعانت کے بغیر موجودہ پارلیمنٹ سے منوانا تقریباً ناممکن ہے۔ لبرل دستوری نظام کی بتدریج شکستگی آج جرمن حکومت کی ضرورت بن گئی ہے۔ اگر اس ضمن میں AfD سے تعاون نہ کیا گیا تو دستوری انجماد رونما ہوگا جس کے نتیجہ میں AfD کی عوامی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوگا اور لبرل نظم اجتماعی کی ناکامی عوام کی نظروں میں اور مستحکم ہو جائے گی۔ AfD کو حکومت سے باہر رکھنے کے لیے غیر جمہوری طریقے اختیار کیے جارہے ہیں مثلاً ۲۰۲۵ء میں قومی اسمبلی کے نائب صدر نے AfD ممبران کو پارلیمنٹری کمیٹیوں کی خدمات سے محروم رکھا اور روایتی جماعتوں میں اب AfD کو قانوناً کالعدم کرنے کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ AfD کو کالعدم کرنے کے لیے ملک کی دستوری عدالت (Bundesverfassungsgericht) کو استعمال کرنا

پڑے گا اور اس کورٹ کے تمام جج AfD کی مخالف جماعتوں نے نامزد کیے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی کارروائی سے AfD کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہو گا۔

## لبرل جمہوری نظام پر کاری ضرب

جرمنی کا دستور حکومتی قرضے کی بڑھوتری پر پابندی عاید کرتا تھا۔ انتخابات کے فوراً بعد مارچ ۲۰۲۵ء میں دونوں حکمران جماعتوں نے قرضے کی بڑھوتری پر لگائی اس حد بندی کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے جرمن دستور میں ترمیم کی ضرورت تھی اور دستور میں ترمیم کے لیے پارلیمنٹ (Bundestag) اور سینٹ (Bundesrat) میں دو تہائی اکثریتی ووٹ درکار تھے۔

۲۰۲۵ء کی منتخب پارلیمنٹ دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کی جدوجہد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس ترمیم کی توجیہ یوکرین کی مدد اور روس کی مفروضہ جارحیت سے مقابلہ کرنے کے لیے فوجی اخراجات میں اضافے کی بنیاد پر پیش کی گئی۔ فوجی اخراجات ۲۰۲۵-۲۰۲۶ کے بجٹ میں پچھلے سال کے مقابلہ میں دگنے کر دیے گئے اور متوقع قرضہ جات کے حصول کے نتیجے میں سماجی اخراجات بھی محفوظ رہے۔ جرمنی کے فوجی اخراجات میں اس ہوش ربا اضافے کو سب یورپی سفارتی حلقوں نے سراہا کیونکہ یہ یورپی یونین کو نیٹو میں تبدیل کرنے کا پہلا قدم ثابت ہو سکتا ہے۔ دستوری ترمیم کے تحت فوجی اخراجات اور انفراسٹرکچر کے اخراجات کو قرضہ جاتی حد بندی (Schuldenbremse) سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ ان تمام سیاسی مراعات کے باوجود حکمران پارلیمنٹ اور سینٹ میں دو تہائی اکثریت کے حصول کو یقینی نہ بنا سکی۔ لہٰذا نو منتخب چانسلر فریڈرک مرز Merz Friedrich نے جمہوری نظام پر ایک شب خون مارا۔ جرمن دستور کے تحت نئی منتخب پارلیمنٹ کو انتخابات کے ۳۰ دن کے بعد اختیارات سونپے جاتے ہیں اور اس عرصہ میں پرانی پارلیمنٹ قانون سازی کے مکمل حقوق رکھتی ہے۔ مرز کی حکومت نے نئی پارلیمنٹ کے اجلاس سے کچھ دن پہلے پرانی پارلیمنٹ سے دستوری ترمیمات منظور کروالیں اور یوں جمہوری نظم پر کاری ضرب لگائی۔ آج جرمنی میں

انتظامیہ مقننہ پر حاوی ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے۔ جرمن دستوری عدالت نے پرانی پارلیمان کا ۳۰ دن کے دورانیے میں حق قانون سازی تسلیم کر لیا۔ پرانی پارلیمنٹ میں بھی دستوری ترمیم کے بل کو نہایت عجلت میں پاس کروایا گیا۔

## لبرل جمہوریت کی شکست وریخت

لبرل جمہوری نظام پوری دنیا میں شکست وریخت کا شکار ہے۔ بائیں اور دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں کا سیاسی عروج لبرل نظاماتی تحلیل کا اظہار ہے۔ کئی کلیدی سرمایہ دارانہ ممالک امریکا، جرمنی، فرانس، برطانیہ، اٹلی میں تحلیل کا یہ عمل زور پکڑ رہا ہے۔ لبرل جمہوریت کا مستقبل تاریک ہے۔ وہ اپنے مراکز میں استبدادی جمہوریت کے سامنے شکست خوردہ نظر آتی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا اہم اور سب سے زیادہ بنیادی تضاد ہے۔ سرمایہ داری کا دعویٰ ہے کہ اس کے نظاماتی غلبے کے دور میں ہر فرد آزاد، خود مختار اور حاکم ہوتا ہے لیکن سرمایہ دارانہ تعقل کی کارفرمائی اس دعوے کو جھوٹا ثابت کر رہی ہے اور جیسے جیسے سرمایے کا ارتکاز بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے فرد کی آزادی، خود مختاری اور حاکمیت مفلوج ہوتی چلی جاتی ہے اور فرد سرمایے کا غلام بنتا چلا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ حقوق کا تحکم افسانوی اور فرضی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ فرد سرمایہ دارانہ اجتماعیتوں-قوم پرستی، فاشزم، اشتراکیت-میں پناہ لینے کو لبرل حقوق کی جستجو پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ یوں سرمایہ دارانہ اجتماعیتوں-فاشزم، سوشلزم وغیرہ-کو عوامی مقبولیت فراہم ہوتی ہے جو بتدریج لبرل نظام کی تحلیل کا سبب بنتی ہے۔

کئی اسلامی تحریکوں نے لبرل جمہوری نظام سے امیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سرمایہ دارانہ نظاماتی تغیرات (dynamics) کے تضادات سے ناواقف ہیں اور ہمیں اس بات کا احساس نہیں کہ لبرل جمہوری نظام اپنے اندرونی تضادات کے اظہار کے طور پر لازماً استبدادیت کو جنم دیتا ہے۔ اسلامی انقلابی تحاریک کو لبرل جمہوری نظام کی کمزوریوں سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمہوری استبدادیت کی ناگزیر رفع پذیری کے لیے تیاری بھی کرنی چاہیے۔

# ربا اور بیع: قرآن، سنت اور فقہی روایت کی روشنی میں سرمایہ دارانہ اسلامی بینکاری کا تنقیدی جائزہ

سید محمد یونس قادری

## ابتدائیہ

قرآنِ مجید نے جب یہ اعلان فرمایا: وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (البقرۃ:۲۷۵) تو اس کے ذریعے معیشت کے لیے ایک بنیادی خطِ امتیاز قائم کر دیا گیا: بیع حلال ہے اور ربا حرام۔ یہ محض ایک فقہی حکم نہیں بلکہ پورے معاشی تصور کی بنیاد ہے۔ جاہلی عرب سود کو تجارت کے مثل سمجھتے تھے، اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا قرآن نے اسی مغالطے کو رد کرتے ہوئے واضح کیا کہ تجارتی منافعہ اور سودی اضافہ ایک نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس قرآنی اصول کو عملی صورت دیتے ہوئے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا: ألا وإن كل ربا من ربا الجاهلية موضوع "خبردار! جاہلیت کا ہر سود آج ختم کیا جاتا ہے" (صحیح مسلم)۔ فقہاءِ اسلام نے اس حکم کی بنیاد پر یہ واضح کیا کہ بیع ایک حقیقی تبادلہ ہے جس میں بائع، مشتری، ثمن اور مثمن موجود ہوتے ہیں، جبکہ ربا محض وقت کے بدلے زر میں اضافہ ہے۔ لیکن جدید سرمایہ دارانہ نظام نے اسی جاہلی منطق کو نئی صورت دے دی ہے۔ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں یہ نظام "سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری" کو انسانی آزادی کا معیار بنا دیتا ہے (تفہیمات)۔

بینکاری، مالیاتی منڈیاں اور زر کی مارکیٹ اسی اصول پر قائم ہیں جہاں سود اور سٹہ قدر کا آلہ بن جاتے ہیں اور حقیقی بیع معدوم ہو جاتی ہے۔ یہ مضمون اسی پس منظر میں یہ واضح کرنے کی کوشش ہے کہ قرآن و سنت کے مقرر کردہ تصورِ بیع کو سرمایہ دارانہ مالیاتی نظام میں کس طرح مسخ کیا گیا اور کیوں اسلامی معاشی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ سودی اداروں اور ڈھانچوں

سے ادارتی اور فکری علیحدگی اختیار کی جائے۔

## ربااور بیع میں فرق

الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۘ وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهٰى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۷۵)

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اُس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے ہو گا کہ وہ کہتے تھے کہ 'تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے' حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ لیکن جو شخص پھر اسی حرکت کی طرف پلٹا وہ دوزخی ہے اور ہمیشہ دوزخ ہی میں رہے گا۔

قرآنِ مجید نے انسانی معاشرت اور معیشت کی بنیاد عدل، توازن اور باہمی خیر خواہی پر رکھی ہے۔ مالی معاملات میں سب سے بنیادی اصول یہ قرار دیا کہ ظلم اور استحصال کی ہر صورت کو جڑ سے ختم کیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت سود (ربا) کو قطعی طور پر حرام اور بیع (تجارت) کو حلال قرار دیا گیا۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۷۵ میں جاہلی ذہنیت کی عکاسی یوں کی گئی: اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا (تجارت بھی تو سود ہی جیسی ہے)۔ اسی مغالطے کو توڑتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کن اعلان فرمایا: وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا۔ (اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربا کو حرام کیا)۔ یہ محض فقہی حکم نہیں بلکہ ایک مکمل معاشی و تہذیبی سمت متعین کرنے والا اصول ہے۔

## جاہلی ربا کی حقیقت

عربِ جاہلیت میں ربا کی معروف صورت یہ تھی کہ کوئی شخص قرض لیتا، مقررہ مدت پر ادا نہ کر پاتا، قرض خواہ کہتا: "اِمّا أن تقضي وإمّا أن تُربي[۱]" یا ادا کرو، یا مدت بڑھالو اور رقم میں اضافہ کر دو۔ یوں وقت کے بدلے رقم بڑھتی جاتی، یہاں تک کہ اصل قرض کئی گنا ہو جاتا۔ یہی وہ ربا تھا جسے قرآن نے نشانہ بنایا۔ عرب اسی لیے کہتے تھے کہ "تجارت بھی تو سود جیسی ہی ہے" کیونکہ دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن نے فرمایا کہ یہ قیاس باطل ہے۔ بیع، حقیقی تبادلہ، محنت، خطرہ اور معاشی سرگرمی ہے۔ اس کے برعکس ربا محض وقت کے بدلے رقم میں اضافہ، بغیر کسی حقیقی تبادلے کے، جو سراسر استحصال ہے۔ اسی لیے قرآن نے اس کے بالمقابل یہ اصول دیا: وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ (اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو اسے آسانی تک مہلت دو)۔ جاہلی نظام کہتا تھا: مدت بڑھاؤ، رقم بڑھاؤ۔ اسلام کہتا ہے: مدت بڑھاؤ، رقم نہ بڑھاؤ، بلکہ نرمی کرو۔ اس اصول کی تائید قدیم مفسرین اور فقہائے اسلام کے ہاں واضح طور پر موجود ہے کہ آیت میں الرِّبَا پر وارد ہونے والا "ال" محض مطلق لفظ نہیں بلکہ ایک متعین اور معروف جنس کی طرف اشارہ ہے یعنی وہی ربا جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا: قرض پر مدت کے بدلے اضافہ (یعنی الف لام یہاں عہدی ہے)[۲] امام قرطبیؒ سورۃ البقرہ (آیت ۲۷۵) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: قولہ تعالیٰ: {إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا }أي إنما الزيادة عند حلول الأجل آخراً كمثل أصل الثمن في أوّل العقد، وذلك أن العرب كانت لا تعرف ربا إلا ذلك؛ فكانت إذا حلّ ديْنها قالت للغريم: إما أن تَقْضِي وإما أن تُرْبِي، أي تزيد في الدَّين. فحرم الله سبحانه ذلك وردّ عليهم قولهم بقوله الحق: { وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا } وأوضح أن الأجل إذا حلّ ولم يكن عنده ما يؤدّي أُنْظِر إلى المَيْسرة. وهذا الربا هو الذي نسخه النبيّ صلى الله عليه وسلم بقوله يوم عرفة لمّا قال: "ألا إن كل رباً

موضوع وإن أوّل رِبا أضعه رِبانا رِبَا عباس بن عبد المطلب فإنه موضوع كله" . فبدأ صلى الله عليه وسلم بعمّه وأخص الناس به. وهذا من سنن العدل للإمام أن يُفيض العدل على نفسه وخاصته فيستفيض حينئذ في الناس. (الجامع لأحكام القرآن، تحت تفسير الآية الكريمة)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا قول: { إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا } (تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے)؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اہلِ جاہلیت کے نزدیک) مدت پوری ہونے پر آخر میں کیا جانے والا اضافہ (سود)، عقد کے آغاز میں طے شدہ اصل قیمت کی طرح ہی تو ہے۔ اور یہ اس لیے تھا کہ عرب اس کے علاوہ کسی اور 'ربا' کو جانتے ہی نہ تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب قرض کی ادائیگی کا وقت آتا تو وہ قرض دار سے کہتے: 'یا تو قرض ادا کرو یا پھر اضافہ کرو (تربی)'، یعنی رقم بڑھا دو۔ پس اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا اور ان کے قول کو اپنے برحق قول سے رد فرمایا: { وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا } (اور اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربا کو حرام)۔ اللہ نے یہ واضح فرما دیا کہ جب مدت پوری ہو جائے اور مقروض کے پاس ادائیگی کے لیے کچھ نہ ہو، تو اسے آسانی ہونے تک مہلت دی جائے گی۔ اور یہ وہی ربا ہے جسے نبی کریم ﷺ نے یومِ عرفہ (حجۃ الوداع) کے موقع پر منسوخ کرتے ہوئے فرمایا تھا: 'خبردار! جاہلیت کا ہر سود ختم (موضوع) کر دیا گیا ہے، اور پہلا سود جسے میں ختم کرتا ہوں وہ ہمارا اپنا سود ہے یعنی عباس بن عبد المطلب کا، وہ مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے'۔ پس آپ ﷺ نے (اصلاح کا) آغاز اپنے چچا اور اپنے سب سے قریبی شخص سے کیا۔ اور حکمران (امام) کے لیے عدل کی روش یہی ہے کہ وہ عدل کا نفاذ پہلے اپنی ذات اور اپنے خاص لوگوں پر کرے، تبھی وہ عام لوگوں میں پوری طرح سرایت کر سکتا ہے۔

امام بغوی آیت شریفہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں.:"إن أهل الجاهلية كان أحدهم إذا حل ماله على غريمه فطالبه فيقول الغريم لصاحب الحق زدني

في الأجل حتى أزيدك في المال فيفعلان ذلك". (معالم التنزیل للبغوي، طبعۃ بالریاض، ۱۴۰۹ھ، ج ۱، ص ۳۴۱).

امام بغویؒ کی عبارت ربا کے "معاہداتی عمل" (Contractual Process) کو واضح کرتی ہے: "اہلِ جاہلیت کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی شخص کا مال (قرض) اس کے مقروض پر واجب الادا ہو جاتا اور وہ اس سے مطالبہ کرتا، تو مقروض صاحبِ حق سے کہتا: 'میری مہلت بڑھا دیں، میں آپ کی رقم میں اضافہ کر دوں گا۔' پس وہ دونوں ایسا ہی کرتے تھے۔"

یہاں امام بغویؒ نے یہ واضح کیا کہ ربا فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوتا تھا۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام اکثر یہ دلیل دیتا ہے کہ "اگر فریقین راضی ہوں تو اضافہ جائز ہونا چاہیے"۔ امام بغویؒ کا یہ حوالہ ثابت کرتا ہے کہ جاہلی سود بھی "باہمی رضامندی" ہی سے تھا، مگر شریعت نے اسے "ظلم" قرار دے کر کالعدم کر دیا۔

امام قاضي ابو بکر ابن العربي اسی سیاق میں لکھتے ہیں: "وكان الربا عندهم معروفاً يبايع الرجل الرجل إلى أجل فإذا حل الأجل قال أتقضي أم تربي .. فحرم الله تعالى الربا .. إن من زعم أن هذه الآية مجملة فلم يفهم مقاصد الشريعة " (أحكام القرآن ، طبعة بيروت ١٩٨٨ ، ج ١، ٣٢٠_٣٢١).

ابن العربیؒ کی عبارت جاہلی معاشرت میں ربا کے رواج کی نشاندہی کرتی ہے:

ترجمہ: "اور ربا ان کے ہاں ایک معروف اور رائج معاملہ تھا۔ (اس کی صورت یہ تھی کہ) ایک شخص دوسرے سے ایک مدت تک کے لیے معاملہ کرتا، پھر جب مدت پوری ہو جاتی تو کہتا: 'ادا کرو گے یا اضافہ کرو گے؟' پس اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام قرار دے دیا... بے شک جس شخص نے یہ گمان کیا کہ یہ آیت مجمل (غیر واضح) ہے، اس نے شریعت کے مقاصد کو سمجھا ہی نہیں۔"

ابن العربیؒ نے لفظ "یبایع" (سودا کرنا / بیع کرنا) استعمال کیا ہے، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ربا کو

بیع (تجارت) کے لبادے میں ہی انجام دیتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے آج کی "اسلامی بینکاری" میں بعض اوقات محض کاغذی بیع کے ذریعے سودا کیا جاتا ہے [جاہلی ربا اکثر کسی معاملۂ بیعِ مؤجل سے شروع ہوتا تھا۔ پھر جب مدت پوری ہوتی تو وہ قرضی صورت اختیار کر لیتا اور اس پر مدت کے بدلے اضافہ کیا جاتا۔ یعنی وہ ربا کو "بیع" کے قانونی سانچے میں رکھتے تھے، لیکن حقیقت میں وہ دَین کے بدلے دَین پر اضافہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان کا قول نقل کیا: (إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا)۔ وہ دراصل بیع اور ربا کے درمیان امتیاز کو مٹا رہے تھے]۔

امام فخر الدین الرازی اپنی مشہور زمانہ تفسیر میں لکھتے ہیں: " أما ربا النسيئة فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية وذلك أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهر قدراً معيناً ويكون رأس المال باقياً ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال. فإن تعذر عليه الأداء في الحق والأجل. فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به" (التفسير الكبير للرازي ، طبعة ١٩٣٨مصر ، ج ٧، ص٩١) .

"جہاں تک ربا النسیئۃ (ادھار کا سود) کا تعلق ہے، تو یہ وہ معاملہ ہے جو جاہلیت میں مشہور اور رائج تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ وہ اس شرط پر مال (قرض) دیتے کہ ہر ماہ ایک متعین رقم وصول کریں گے جبکہ اصل رقم (Principal) اپنی جگہ باقی رہے گی۔ پھر جب قرض کی ادائیگی کا وقت آتا تو وہ مقروض سے اصل رقم کا مطالبہ کرتے۔ اگر وہ ادا نہ کر پاتا تو وہ رقم (حق) اور مہلت (اجل) دونوں میں اضافہ کر دیتے۔ پس یہی وہ ربا ہے جس کے ساتھ وہ جاہلیت میں معاملہ کیا کرتے تھے۔"

یہ تمام نصوص اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن نے جس الرِّبَا کو حرام قرار دیا ہے وہ کوئی مبہم تصور نہیں، بلکہ وہی متعین جاہلی قرضی سود ہے، جس کی حقیقت "وقت کے بدلے رقم میں اضافہ" ہے۔ اسی بنا پر فقہائے اسلام نے یہ اصول اخذ کیا کہ كل زيادة مشروطة في

القرض لأجل الزمن فهي ربا، وإن تغيَّر اسمها أو صورتها.(مفهوم ماخوذ از: امام جصاص أحكام القرآن، ج، ١، ص ٤٢٩).

یعنی کہ قرض میں وقت کے بدلے جو بھی اضافہ شرط کے طور پر رکھا جائے وہ ربا ہے، خواہ اس کا نام بدل دیا جائے یا اس کی صورت بدل دی جائے۔

ابن عبد البر نے تمہید میں اور ابن رشد نے بداية المجتهد میں ربا کی اس تعریف پر اجماع نقل کیا ہے (بحوالہ مولانا گوہر رحمان صاحب الملحق ١، حكم المحكمة الشرعية الاتحادية الباكستانية)[٣]

معاصر دور میں مفتی تقی عثمانی اسی اصول کو یوں بیان کرتے ہیں: "قرآن نے جس ربا کو حرام کیا ہے وہ محض ایک تاریخی صورت نہیں بلکہ ایک اصول ہے: قرض پر وقت کے بدلے اضافہ۔ نام بدل جائے، ادارہ بدل جائے، یا شکل جدید ہو جائے، حقیقت اگر وہی ہے تو حکم بھی وہی ہے۔" (اسلام اور جدید معیشت، ص ١٦٠–١٦٨)

یوں آیت میں البیع پر وارد "ال" اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ بیع ایک عمومی اور فطری انسانی عمل ہے[٤] اور ربا (ال یہاں عہدی ہے جیسا کہ امام قرطبی کے حوالے سے اوپر بیان ہوا) ایک مخصوص، متعین اور ممنوع جنس ہے جو ظلم اور استحصال پر قائم ہے اور صورت، نام یا زمانہ بدلنے سے وہ حلال نہیں ہو جاتا۔ یہی وہ فہم ہے جس پر کلاسیکی فقہ اور اسلامی معاشی فکر کی پوری عمارت قائم ہے۔

## بیع کی حقیقت اور اس کے ارکان

بیع لغت میں تبادلہ ہے: باع کذا بکذا، کسی نے عوض دیا اور معوض لیا[٥]۔ فقہ میں بیع کے چار ارکان ہیں:

١. بائع (بیچنے والا/seller)
٢. مشتری (خریدار/buyer)
٣. ثمن (قیمت/price)

۴. مثمن (مبیع/product/وہ چیز جو بیچی جا خریدیں جارہی ہے)

ربا (سود) میں 'مثمن' (مبیع) غائب ہوتا ہے۔ وہاں ثمن کا تبادلہ ثمن سے (پیسے کا پیسے سے) محض وقت کے اضافے کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب 'مثمن' موجود نہ ہو، تو وہ 'بیع' کے زمرے سے نکل کر 'قرض' بن جاتا ہے۔

بیع حقیقی تبادلے، خطرے اور محنت پر قائم ہوتی ہے۔ اس میں نفع جائز ہے کیونکہ یہ معاشی سرگرمی کا فطری نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس ربا میں کوئی حقیقی تبادلہ نہیں، محض وقت کے بدلے اضافہ ہوتا ہے، اور یہی ظلم ہے۔

حضرت بلالؓ نے دو صاع ردی کھجوریں ایک صاع عمدہ کھجور کے بدلے دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اوہ! یہی تو عین ربا ہے... پہلے کھجوریں بیچو، پھر ان کے ثمن سے عمدہ کھجور خرید لو۔" یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جہاں ہم جنس اشیاء میں زیادتی ہو، وہاں بیع کی شکل میں بھی ربا داخل ہو جاتا ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک ایسی بیع فسخ ہوتی ہے؛ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بیع اصل میں صحیح ہے مگر وصفِ ربا کی وجہ سے ممنوع ہے، یہ فقہی اختلاف اپنی جگہ، مگر (اس کے) ربا ہونے اور اس کی حرمت پر سب متفق ہیں۔

## ربااور بیع

بیع کا اصل محرک شے اور آلۂ تبادلہ یعنی ثمن ہے۔ ثمن سے ثمن اور اشیاء سے اشیاء کا تبادلہ اگر وقت اور زیاتی کے ساتھ ہو تو وہ سود کی شکل ہے۔

ربا کی حرمت اور قرض حسن کی فضیلت کی حکمت

امام جعفر بن محمد الصادقؒ فرماتے ہیں: 'اللہ تعالیٰ نے سود کو اس لیے حرام قرار دیا تاکہ لوگ ایک دوسرے کو (بغیر نفع کے) قرض دیں۔' اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'دو مرتبہ قرض دینا ایک مرتبہ صدقہ دینے کے برابر ہے' (اسے البزار نے روایت کیا ہے)۔ اور بعض اہل علم نے کہا: 'اللہ نے سود کو اس لیے حرام کیا کیونکہ یہ مال کو ضائع کرنے والا اور لوگوں کو ہلاک کرنے والا ہے[٦]۔ یہ معاشرتی رشتوں میں فساد

اور ظلم پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے شریعت نے محرمات تک پہنچنے کے تمام راستے بند کیے، جیسے قلیل شراب بھی حرام، اجنبیہ سے خلوت بھی حرام، تاکہ انسان گناہ کے قریب نہ جائے۔ ربا کے معاملے میں یہ اصول بدرجۂ اولیٰ نافذ ہوتا ہے کہ اس کے قریب ہونے والی بیع سے بچو جیسے مرابحہ، اجارہ جیسے فکس ریٹ کے معاہدات[۷]۔

ربا کے باب میں شریعت کا مزاج صرف "صریح ربا" کو حرام قرار دینا ہی نہیں، بلکہ ہر اس راستے کو بند کرنا بھی ہے جو عملی طور پر ربا تک لے جائے یا اس کے مشابہ ہو۔ اسی کو فقہ کی اصطلاح میں سدّ الذرائع کہا جاتا ہے، یعنی حرام تک پہنچانے والے ذرائع کو بھی بند کر دینا۔

اس اصول کی بنیاد قرآن و حدیث دونوں میں موجود ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا (البقرہ:۲۷۸) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ربا میں سے جو باقی رہ گیا ہے اسے بھی چھوڑ دو۔

یہ آیت محض "ربا لینے" سے نہیں روکتی بلکہ "ربا سے متعلق ہر باقی پہلو" کو ترک کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا قول: { يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا } (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو)؛ اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ سود کی وہ تمام مقدار باطل کر دی گئی جو ابھی وصول نہیں کی گئی تھی، چاہے اس کا معاہدہ تحریمِ ربا کی آیت نازل ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ ہو چکا ہو۔ البتہ جو سود پہلے ہی وصول کیا جا چکا تھا، اسے (واپس کرنے کے لیے) نہیں کہا جائے گا۔۔۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ: 'باقی ماندہ سود کو چھوڑ کر اور اس سے درگزر کر کے اپنے اور اللہ کے عذاب کے درمیان ڈھال (وقایہ) بنالو" [الجامع لأحكام القرآن تحت تفسير الآية الشريفة]

نبی ﷺ نے فرمایا: "إن الحلال بيّن وإن الحرام بين، وبينهما أمور مُشْتَبِهَاتٌ لا يعلمهن كثير من الناس، فمن اتقى الشُّبُهات فقد اسْتَبْرَأ لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام، كالراعي يرعى

حول الحِمى يوشك أن يَرْتَع فيه، ألا وإن لكل مَلِك حِمى، ألا وإن حِمى الله محارمه، ألا وإن في الجسد مُضغة إذا صلحت صلح الجسد كله وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب "(عن النعمان بن بشير رضي الله عنه في الصحيحين)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"بے شک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جس نے شبہات سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو محفوظ کر لیا، اور جو شبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں جا پڑا۔ اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو محفوظ چراگاہ کے ارد گرد اپنے جانور چراتا ہے؛ قریب ہے کہ وہ اس کے اندر جا چرائے۔ خبردار! ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے، اور خبردار! اللہ کی محفوظ چراہ گاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے، اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے؛ سن لو! وہ دل ہے۔"

ربا چونکہ قرآن میں اعلانِ جنگ کے ساتھ حرام کیا گیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں احتیاط کا درجہ عام حرام چیزوں سے کہیں زیادہ ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ: كل زيادة مشروطة في القرض لأجل الزمن فهي ربا، وإن تغيّر اسمها أو صورتها (قرض میں وقت کے بدلے ہر مشروط اضافہ ربا ہے، چاہے اس کا نام بدل دیا جائے یا صورت تبدیل کر دی جائے)[۸]۔ اسی اصول کی روشنی میں یہ کہا گیا ہے کہ ربا کے معاملے میں یہ قاعدہ بدرجۂ اولیٰ نافذ ہوتا ہے کہ اس کے قریب بھٹکنے ہونے والی بیع سے بھی بچا جائے۔ یعنی وہ معاملات جو ظاہری طور پر "بیع" کہلاتے ہوں، مگر ان کی حقیقت قرض پر وقت کے بدلے فکس اضافہ ہو، وہ اگرچہ قانونی شکل میں "مرابحہ" یا "اجارہ" کہلائیں تب بھی ان میں شدید احتیاط لازم ہے۔

## جدید بینکاری: جاہلی ربا کی نئی صورت

قدیم فقہاء کے استدلال کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ ربا وہی ہے جو جاہلیت میں تھا: قرض پر مدت کے بدلے اضافہ۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام نے اسی ربا کو ادارہ جاتی شکل دے دی ہے، مرکزی بینک، کمرشل بینک اور پورا مالیاتی ڈھانچہ اسی اصول پر قائم ہے۔ اسلامی بینکاری نے بظاہر بیع کے آلات متعارف کرائے، مگر چونکہ یہ پورا تجربہ اسی سودی نظام کے اندر کیا گیا، اس لیے حلال اور حرام میں اختلاط پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ وضاحت جو حدیث میں مطلوب ہے، "بیشک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح"، عملاً دھندلا گئی ہے۔

فقہائے کرام نے ربا کو دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا ہے: ربا الفضل اور ربا النسیئہ۔ یہ تقسیم اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ ربا کی آمیزش صرف قرض کے باب میں ہی نہیں تھی بلکہ لین دین کے دوسرے معاملات میں بھی موجود تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم معاشروں میں کرنسی یا ثمن محض سکوں تک محدود نہ تھا، بلکہ لوگ باہم اشیاء کا تبادلہ بھی کرتے تھے، جسے آج کی اصطلاح میں بارٹر کہا جاتا ہے۔ انہی تبادلہ جات میں کمی بیشی، عدمِ مساوات اور تاخیر کی صورتیں پیدا ہوتیں، جن سے ربا الفضل اور ربا النسیئہ کی صورتیں وجود میں آئیں۔

مولانا گوہر رحمان صاحب اس سلسلے میں تفصیلی بحث کے بعد خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں:

إنَّ ما سَبَقَ من تَعريفِ الرِّبا هو تَعريفٌ لِلرِّبا الذي ثَبَتَ تَحريمُهُ بِالآياتِ الثَّمانِ المَذكورَةِ من القُرآنِ الكَريمِ. وتَحريمُهُ قَطعيٌّ وتَعريفُهُ أيضاً مُتَّفَقٌ عليهِ، وليسَ فيهِ أيُّ إبهامٍ وإجمالٍ. وهذا هو الرِّبا الذي كانَ مَشهوراً مُتعارَفاً بينَ العَرَبِ يَحسَبونَهُ حَلالاً مِثلَ البَيعِ. ويُقالُ له «رِبا القُرآنِ» أيضاً لأنَّ تَحريمَهُ ثابِتٌ من القُرآنِ. ويُسمّى أيضاً «الرِّبا الجَلِيَّ» و«الرِّبا الحَقيقيَّ» لأنَّهُ رِبا بِوُضوحٍ وجَلاءٍ وبالمَعنى الحَقيقيِّ وليسَ مُجَرَّدَ وسيلَةٍ لِلرِّبا. واسمُهُ المَعروفُ هو «رِبا النَّسيئَةِ» لأنَّهُ رِبا يُؤخَذُ على النَّسيئَةِ.

ولكنَّ هُناكَ نوعاً آخَرَ أيضاً من الرِّبا يُقالُ له «الرِّبا الحُكمِيُّ» لأنَّهُ يُطلَقُ عليهِ حُكمُ الرِّبا ورُبَّما يُصبِحُ وسيلَةً لِلرِّبا الحَقيقيِّ الجَلِيِّ. ويُسمّى أيضاً «رِبا الفَضلِ» لأنَّهُ يُحظَرُ فيهِ الفَضلُ والزِّيادَةُ من طَرَفٍ حتَّى وفي البَيعِ يداً بِيَدٍ. وليسَ هذا النَّوعُ من الرِّبا ثابِتاً من القُرآنِ بَل هوَ ثابِتٌ من الأحاديثِ الصَّحيحَةِ. وهذا التَّحريمُ سَدّاً لِلذَّرائعِ، والأحاديثُ في تَحريمِ رِبا الفَضلِ كَثيرَةٌ."(مولانا گوہر رحمان صاحب الملحق ا، حکم المحکمۃ الشرعیۃ، ص،۳۰۸-۳۰۹).

ترجمہ: ربا کی جو تعریف اوپر گزری ہے، یہ اس ربا کی تعریف ہے جس کی حرمت قرآن کریم کی مذکورہ بالا آٹھ آیات سے ثابت ہے۔ اس کی حرمت قطعی ہے اور اس کی تعریف بھی متفق علیہ ہے، اس میں کوئی ابہام یا اجمال نہیں ہے۔ یہی وہ ربا ہے جو عربوں کے درمیان مشہور اور متعارف تھا اور وہ اسے بیع کی طرح حلال سمجھتے تھے۔ اس کو 'ربا القرآن' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی حرمت قرآن سے ثابت ہے۔ اسے 'ربا جلی' اور 'ربا حقیقی' بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ اپنے حقیقی معنی میں سود ہے، نہ کہ سود کا محض ایک ذریعہ۔ اس کا معروف نام 'ربا النسیئۃ' ہے کیونکہ یہ ادھار پر لیا جانے والا سود ہے۔

لیکن ربا کی ایک دوسری قسم بھی ہے جسے 'ربا حکمی' کہا جاتا ہے، کیونکہ اس پر ربا کا حکم لاگو ہوتا ہے اور یہ بسا اوقات حقیقی ربا کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسے 'ربا الفضل' بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں (بیع کے فریقین میں سے) ایک طرف سے اضافے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، خواہ سود ادست بدست اور نقد ہی کیوں نہ ہو۔ ربا کی یہ قسم قرآن سے نہیں بلکہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ یہ تحریم 'سدِ ذرائع' کے طور پر ہے (یعنی سود کے راستوں کو بند کرنے کے لیے)۔ ربا الفضل کی تحریم میں احادیث کثرت سے ملتی ہیں ہیں۔

## سرمایہ دارانہ نظام، سود اور مالیاتی منڈی کی ماہیت

جدید سرمایہ دارانہ دور میں اس فطری اور محدود تبادلے کو ایک منظم اور ہمہ گیر "مارکیٹ"

میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب صرف بازار ہی مارکیٹ نہیں رہا، بلکہ پورا معاشرہ ایک بڑی منڈی بن چکا ہے جہاں ہر رشتہ، ہر ضرورت اور ہر قدر کو نفع اور غرض کے پیمانے پر تولا جاتا ہے۔ اس نظام میں لین دین کا بنیادی محرک ضرورت نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ منافع ہے۔ اسی تصور کے تحت مارکیٹ کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے:

۱۔ مالیاتی مارکیٹ (زر اور سرمائے کی منڈی): یہاں قرض خریدا اور بیچا جاتا ہے، زر کی تجارت ہوتی ہے، اور حصص (Shares) کی خرید و فروخت قمار اور سٹے کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ یہ وہ میدان ہے جہاں "وقت کے بدلے رقم" اصل قدر بن جاتی ہے، اور سرمایہ محض عددی حرکات کے ذریعے بڑھتا اور گھٹتا ہے۔

۲۔ اشیاء کی مارکیٹ: یہاں بظاہر اشیاء کو ثمن کے عوض خریدا اور بیچا جاتا ہے، مگر اس پورے عمل پر بھی وہی سرمایہ دارانہ روح حاوی رہتی ہے جس کی بنیاد حرص، حسد اور لامحدود منافع کی خواہش ہے۔ بیع یہاں بھی فطری انسانی ضرورت کے بجائے سرمایہ کی بڑھوتری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ایسے ماحول میں ربا بالفضل کی عملی صورتیں نہایت محدود ہو جاتی ہیں، کیونکہ اشیاء کے براہِ راست تبادلے (جیسے گندم کے بدلے گندم) اب زندگی کے مرکز میں نہیں رہے۔ اصل میدان وہی مالیاتی منڈی بن جاتی ہے جہاں ہر معاملہ وقت، قرض اور زر کی بنیاد پر طے ہوتا ہے۔ نتیجتاً جہاں بھی جدید بینکاری قائم ہو گی، وہاں غالب صورت ربا النسیئۃ ہی ہو گی، وہی جاہلی ربا جس کی بنیاد "قرض پر مدت کے بدلے اضافہ" تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید بینکاری کا پورا ڈھانچہ، قرض پر قرض کو جنم دیتا ہے، قرض کی تشکیل پر مزید قرض پیدا کرتا ہے اور اسی بنیاد پر سرمایے کی تشکیل اور گردش کو غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھاتا ہے۔ یوں جدید مالیاتی نظام اپنی حقیقت میں اسی جاہلی منطق کا تسلسل ہے جسے قرآن نے رد کیا تھا اور جسے نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے دن ہمیشہ کے لیے منسوخ فرما دیا تھا۔ نام بدل گئے، صورتیں جدید ہو گئیں، مگر حقیقت وہی رہی وقت کے بدلے رقم میں اضافہ، یعنی ربا النسیئۃ۔

سرمایہ دارانہ نظام میں معاش محض انسانی ضرورت نہیں بلکہ پورے نظام کا مرکزی ستون ہے۔ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں یہ ایک "مکمل معاشی نظام" ہے جس کا ہر جز اس کے کل کو فروغ دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ مگر اس نظام کی بنیاد انسان کی فلاح نہیں بلکہ سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری ہے۔ یعنی سرمایہ خود مقصد بن جاتا ہے، اور انسانی آزادی کو اسی سرمائے کی لامتناہی افزائش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی تصور کے تحت سرمایہ دارانہ نظام زر اور سرمائے کی منڈی میں سود اور سٹے (قمار) کے ذریعے سرمایے کو بڑھاتا ہے۔ سود اس نظام کا کوئی ضمنی یا حادثاتی پہلو نہیں بلکہ اس کا جزءِ لاینفک ہے۔ بینک اسی منطق پر قائم ہیں: قرض پر قرض، اور قرض سے مزید قرض یعنی Credit creation۔ اس عمل میں سرمایہ "زر کی مارکیٹ" میں گردش کرتا ہے اور اس کی رفتار کو لامتناہی حد تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ سرمایہ لمحوں اور منٹوں میں بڑھتا اور گرتا رہتا ہے، بغیر اس کے کہ کسی حقیقی شے کی پیداوار ہو، یا کسی واقعی بیع و شراء کا عمل وقوع پذیر ہو۔ چنانچہ مالیاتی منڈی میں قدر کا آلہ نہ تو محنت بنتی ہے اور نہ پیداوار، بلکہ ربا اور قمار ہی قدر کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

حقیقی بیع کے ارکان اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ فقہی زبان میں یوں کہا جاتا ہے کہ: عقدِ بیع میں بائع، مثمن کو مشتری کے حوالے کرتا ہے، اور مشتری، اس کے بدلے ثمن ادا کرتا ہے۔ ان ارکان کا سرمایہ دانہ ترقی یافتہ مالیاتی مارکیٹ میں سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا۔ نہ حقیقی بائع ہوتا ہے، نہ واقعی مشتری؛ نہ کوئی حقیقی مبیع گردش میں ہے، نہ ثمن کسی حقیقی تبادلے کا مظہر ہے۔ پوری منڈی محض عددی اشارات، سودی وعدوں اور قیاسی معاہدات پر کھڑی ہوتی ہے۔

## اسلامی بینکاری

بد قسمتی سے اسلامی بینکاری اور مالیاتی ادارے بھی، جب اسی سودی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے کام کرتے ہیں، تو وہ عملاً اسی ربا کو "بیع" کی تعبیر دے دیتے ہیں۔ قرض کو بیع کا لباس پہنا کر، اور سرمایے کی اکیومیلیشن (accumulation) (بڑھوتری برائے بڑھوتری) کو

اسی رفتار سے برقرار رکھتے ہوئے، وہ بائع، مشتری، ثمن اور مثمن کے حقیقی تعلق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یوں یہ ادارے بھی:

- قرض پر قرض کے نظام کو جاری رکھتے ہیں،
- زر کی خود کار افزائش کو برقرار رکھتے ہیں،
- اور بالآخر سود اور سٹے کے جواز کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام کی معاشی فکر اور سرمایہ دارانہ منڈی کے درمیان بنیادی تصادم آشکار ہوتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں بیع ایک حقیقی تبادلہ ہے جو محنت، خطرے اور ضرورت سے جڑا ہوتا ہے؛ جبکہ سرمایہ دارانہ مالیاتی منڈی میں "بیع" محض ایک اصطلاح رہ جاتی ہے، اور حقیقت میں وہی جاہلی ربا نئی صورت میں کارفرما ہوتا ہے، جسے قرآن نے وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا کہہ کر صراحتاً رد کر دیا تھا۔ لہٰذا جب تک اسلامی مالیات سودی نظام کی ادارتی گرفت سے آزاد ہو کر، بیع کو اس کے حقیقی شرعی مفہوم کے ساتھ از سرِ نو قائم نہیں کرتیں، تب تک وہ لاشعوری طور پر اسی مغالطے کو زندہ رکھتی رہیں گی جسے قرآن نے جاہلیت کا فتنہ قرار دیا تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا۔

## ربا اور دیگر محرمات سے تحفظ کے اصول

ا۔ دراہم کی بیع کا مسئلہ:

ابن عبد البر الاستذکار الجامع لمذاھب فقھاء الأمصار وعلماء الأقطار میں لکھتے ہیں:

"وَلَا أَعْلَمُ خِلَافًا بَيْنَ أَئِمَّةِ الْأَمْصَارِ بِالْحِجَازِ وَالْعِرَاقِ، وَسَائِرِ الْآفَاقِ فِي أَنَّ الدِّينَارَ لَا يَجُوزُ بَيْعُهُ بِالدِّينَارَيْنِ، وَلَا بِأَكْثَرَ مِنْهُ وَزْنًا، وَلَا الدِّرْهَمُ بِالدِّرْهَمَيْنِ، وَلَا بِشَيْءٍ مِنَ الزِّيَادَةِ عَلَيْهِ؛ إِلَّا مَا كَانَ عَلَيْهِ أَهْلُ مَكَّةَ قَدِيمًا وَحَدِيثًا مِنْ إِجَازَتِهِمُ التَّفَاضُلَ فِي ذَلِكَ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ، أَخَذُوا ذَلِكَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ - رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ - فَإِنَّهُ كَانَ يَقُولُ: لَا بَأْسَ بِالدِّرْهَمِ بِالدِّرْهَمَيْنِ، وَإِنَّمَا الرِّبَا فِي النَّسِيئَةِ؛ لِمَا رَوَاهُ عَنْ أُسَامَةَ بْنِ

زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: «لَا رِبَا إِلَّا فِي النَّسِيئَةِ».[۹]

ترجمہ: میں (امام ابن عبد البرؒ) حجاز، عراق اور دیگر تمام بلاد کے ائمہ کے درمیان اس مسئلے میں کسی اختلاف سے واقف نہیں کہ ایک دینار کو دو دینار کے بدلے، یا اس سے زیادہ وزن کے عوض فروخت کرنا جائز نہیں، اور نہ ہی ایک درہم کو دو درہم کے بدلے، یا اس پر کسی بھی قسم کی زیادتی کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔ البتہ اہلِ مکہ کا وہ موقف مستثنیٰ ہے جو قدیم اور بعد کے زمانوں میں ان کے ہاں معروف رہا، کہ اگر معاملہ دست بدست (نقد) ہو تو اس میں کمی بیشی (تفاضل) جائز ہے۔ انہوں نے یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اخذ کیا تھا، کیونکہ وہ فرمایا کرتے تھے: "درہم کے بدلے دو درہم لینے میں کوئی حرج نہیں؛ ربا تو دراصل نسیئہ (ادھار) ہی میں ہے۔"

ابن عباسؓ کا یہ استدلال اس روایت پر تھا جو انہوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ سے نبی کریم ﷺ کے حوالے سے نقل کی تھی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: 'ربا صرف نسیئہ (ادھار) میں ہی ہوتا ہے۔

یہاں مندرجہ ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

● جمہور کا اجماع: ابن عبد البرؒ یہ واضح کر رہے ہیں کہ اگرچہ مکہ میں ایک وقت میں ربا الفضل کی اجازت دی گئی تھی، مگر حجاز اور عراق (اہلِ مدینہ اور اہل کوفہ) کے تمام جلیل القدر فقہاء اس کی حرمت پر متفق ہو گئے تھے۔

● جمہور محدثین و فقہاء کے نزدیک ابن عباسؓ نے بعد میں اپنے اس قول سے رجوع فرما لیا تھا، جب ان تک ربا الفضل کی ممانعت پر وارد دیگر احادیث پہنچیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم أبو العباس القرطبي - ضياء الدين أحمد بن عمر القرطبي، باب ترك قول من قال لا ربا إلا في النسيئة)[۱۰].

● جو لوگ "لا ربا إلا في النسيئة" (ربا صرف ادھار میں ہے) کی حدیث کو بنیاد بنا کر نقد کے پیچیدہ تجارتی معاہدوں (جیسے 'کموڈٹی مرابحہ') میں زیادتی کو جائز کرنا چاہتے ہیں، وہ دراصل اسی 'مکی موقف' کی طرف لوٹ رہے ہیں جسے پوری امت کے فقہاء نے صدیوں پہلے رد کر دیا تھا۔ امام ابن عبد البرؒ نے "الحجاز والعراق وسائر الآفاق" کے الفاظ استعمال کر کے یہ ثابت کیا کہ حرمتِ ربا (الفضل) پر پوری امت کا اجماع ہو چکا تھا۔ یہ جدید بینکاری کے اس استدلال کو کمزور کرتا ہے جو "ضرورت" یا "اختلاف" کی آڑ میں سود کی مشابہت والی مصنوعات کو حلال کرنا چاہتے ہیں۔ حدیثِ اسامہ "لا ربا إلا في النسيئة" کا درست مفہوم یہ ہے کہ ربا کا سب سے بڑا اور اصل گناہ ادھار میں ہے، نہ کہ یہ کہ نقد میں زیادتی بالکل حلال ہے۔

۲۔ شریعتِ اسلامی نے بعض محرمات کے باب میں یہ اصول اختیار کیا ہے کہ ان کی قلیل مقدار یا ان تک پہنچانے والے وسائل کو بھی ممنوع قرار دیا جائے، تاکہ اصل مفسدہ کے وقوع کا دروازہ بند رہے۔

چنانچہ:

● نشہ آور چیز کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے، اگرچہ وہ بذاتِ خود نشہ پیدا نہ کرے، کیونکہ اصل ممانعت نشہ کے سدِّباب کے لیے ہے۔

● اجنبیہ عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرنا حرام ہے، خواہ فریقین میں سے کوئی جسمانی طور پر معذور ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ خلوت بذاتِ خود فتنہ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

● نوجوان عورت کی طرف شہوت کے اندیشے کے ساتھ نظر کرنا ممنوع ہے، اگرچہ محض نظر بذاتِ خود زنا نہیں۔

یہ تمام احکام اس اصول پر مبنی ہیں جسے فقہاء سدِّ ذرائع کہتے ہیں، یعنی اُن اسباب اور راستوں کو بند کرنا جو کسی بڑے حرام تک پہنچا سکتے ہوں، تاکہ انسان شیطانی وساوس اور تدریجی لغزشوں سے محفوظ رہے۔

۳۔ ربا کے معاملے میں احتیاط کی اہمیت: ربا کے معاملے میں یہ احتیاط اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ملحوظ رکھی گئی ہے، کیونکہ ربا محض ایک انفرادی گناہ نہیں بلکہ ایک ایسا مالیاتی نظام پیدا کر سکتا ہے جس میں معاشی استحصال اور معاشرتی ظلم کے وسیع امکانات جنم لیتے ہیں۔

اسی بنا پر فقہاء نے حدودِ الٰہی کو "چراگاہ" سے تشبیہ دی ہے، اور اس کے قریب جانے سے بھی منع کیا ہے، تاکہ کوئی شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر ربا میں مبتلا نہ ہو جائے۔

ربا الفضل کی تحریم کو بھی اسی تناظر میں سمجھا جاتا ہے کہ اگر نقد معاملات میں تفاضل کی مطلق اجازت دے دی جائے تو وہ تدریجاً ربا النسیئۃ اور صریح استحصال کی طرف منتہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا شارع نے اس کے ابتدائی راستوں کو بھی مسدود فرما دیا۔

اسلامی بینکاری ان اصول سے انحراف کرتی ہے اور سودی اداروں سے منسلک ہو کر اسکے ماڈل کی اسلام کاری کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جو اسکو سودی نظام یعنی سرمایہ داری کے فروغ کا ادارہ بنا دیتی ہے۔ سرمایہ دانہ مالیاتی مارکیٹ کی اصل روح کو جانے بغیر اس میں شریک ہو کر اسلام کو اسکے تابع کر دیتی ہے۔ حیلہ اور تعبیرات کے ذریعہ اسلامی مالیاتی نظام کو سرمایہ دانہ نظام کا حصہ بنا دیتی ہے۔ اسلامی بینکاری نے بظاہر بیع کے آلات متعارف کرائے، مگر چونکہ یہ پورا تجربہ اسی سودی نظام کے اندر کیا گیا، اس لیے حلال اور حرام میں اختلاط پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ وضاحت جو حدیث میں مطلوب ہے کہ بیشک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح۔ اسلامی بینکاری میں یہ فرق عملاً دھندلا گیا ہے۔

## اسلامی بینک کے اثاثوں کا استعمال

اسلامی بینک کے اثاثے عملی طور پر جن شعبوں میں زیادہ تر استعمال ہوتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ مالیاتی آلات اور حکومتی سیکیورٹیز

اسلامی بینک اپنے بڑے حصے کو سکوک (Government & Corporate Sukuk)، اسلامی ٹریژری بلز، دیگر کم رسک اسلامی سیکیورٹیز میں لگاتے ہیں۔ یہ سرمایہ

کاری زر کی مارکیٹ میں ہوتی ہے، نہ کہ حقیقی اشیا کی پیداوار یا تجارت میں۔

۲۔ قلیل مدتی فنانسنگ (Trade-based Financing)

جو حصہ "اسلامی فنانسنگ" کہلاتا ہے، وہ بھی عموماً مرابحہ، اجارہ، سلم / استصناع (محدود پیمانے پر) کی صورت میں ہوتا ہے، مگر یہ زیادہ تر مختصر مدت، کم خطرہ اور یقینی منافع پر مبنی ہوتا ہے، نہ کہ طویل مدتی شراکت یا حقیقی کاروباری شرکت پر۔

۳۔ طویل مدتی مشارکت و مضاربت کا فقدان

اسلامی بینکوں میں حقیقی مشارکہ، طویل مدتی مضاربت اور براہِ راست صنعتی یا زرعی سرمایہ کاری نہایت کم ہوتی ہے، کیونکہ ان میں نفع غیر یقینی، خطرہ زیادہ اور واپسی سست ہوتی ہے، جو بینکاری کے موجودہ ماڈل سے مطابقت نہیں رکھتی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینکاری عملاً معاشی پیداوار کے بجائے زر کی گردش کا نظام بن جاتی ہے، اور ثمن حقیقی بیع کا خادم بننے کے بجائے خود ایک شے (Commodity) بن جاتا ہے، جو بعینہٖ وہی بگاڑ ہے جسے شریعت نے "ربا" کے ذریعے بند کیا تھا۔

## فقہی اور اقتصادی نقطہ نظر

یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی بینکنگ آج بھی زیادہ تر "ربا النسیہ" کے جاہلی اصول کے قریب ہے، کیونکہ یہ سرمایے کو حقیقی تجارت اور معیشت کی خدمت کے بجائے صرف مالیاتی آلات اور قلیل مدتی منافع میں استعمال کرتی ہے، شریعت کے مطابق صحیح بیع (تجارت) میں بائع، مشتری، ثمن اور مثمن کا حقیقی تعلق ضروری ہے، جبکہ جدید اسلامی بینکنگ میں یہ تعلق بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس ہی بنا پر اسلامی نظریاتی کونسل کی ۱۹۸۰ء کی تاریخی معاشی رپورٹ میں یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ مرابحہ اور اجارہ جیسے طریقے اگرچہ فقہی طور پر بعض شرائط کے ساتھ جائز صورتیں رکھتے ہیں، لیکن جب انہیں جدید بینکاری کے ڈھانچے میں "فکس ریٹرن" کے متبادل کے طور پر اختیار کیا جائے تو وہ عملاً سود کو پچھلے دروازے سے واپس لانے کے مترادف بن جاتے ہیں۔

## اختتامیہ و تتمہ

اسلام نے ربا کو محض ایک مالی خرابی نہیں بلکہ ایک تہذیبی فساد قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سود خور کو قیامت میں مخبوط الحواس انسان کے مانند اٹھنے کی وعید سنائی اور نبی کریم ﷺ نے جاہلی سود کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا اعلان فرمایا۔ اس کے مقابلے میں بیع کو حلال قرار دے کر ایک ایسا معاشی ڈھانچہ قائم کیا گیا جو حقیقی تبادلے پر قائم ہو، محنت اور خطرے سے جڑا ہو، اور انسانی حاجت و تعاون کو فروغ دے۔ سرمایہ دارانہ مالیاتی نظام اس کے برعکس زر کی خودکار افزائش کو مقصد بناتا ہے، جہاں نہ بائع باقی رہتا ہے نہ مشتری، نہ مثمن موجود ہوتا ہے نہ حقیقی ثمن۔ وہاں ربا اور قمار قدر کا آلہ بن جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے جب اسلامی بینکاری اسی ڈھانچے کے اندر رہ کر "بیع" کی تعبیر کرتی ہے تو وہ عملاً اسی جاہلی مغالطے کو زندہ رکھتی ہے جسے قرآن نے رد کیا تھا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے الحلال بيّن والحرام بيّن (بخاری)۔ یعنی حلال اور حرام کے درمیان خطِ فاصل واضح ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشی احیاء کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس خطِ فاصل کو محض نظری طور پر نہیں بلکہ ادارتی اور عملی سطح پر قائم کریں۔ سودی مرکزی بینک، کمرشل بینک، اور مالیاتی منڈیوں سے محض "اسلامی آلات" کے ذریعے ہم آہنگی کافی نہیں؛ بلکہ ایک ایسی مکمل علیحدگی درکار ہے جو قرض پر قرض کے ڈھانچے کو توڑے، زر کی خودکار افزائش کو روکے اور بیع کو اس کے حقیقی شرعی مفہوم کے ساتھ معاشرے میں دوبارہ زندہ کرے۔ جب تک اسلامی معاشی جدوجہد اس جاہلی نظام کے خلاف واضح صف بندی نہیں کرتی، تب تک سود نئی شکلوں میں باقی رہے گا اور "بیع" محض ایک اصطلاح بن کر رہ جائے گی۔ حقیقی معیشت اسلامی وہی ہے جو قرآن کے اس اعلان کو عملاً نافذ کرے کہ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا۔

درج ذیل حدیث سے اپنی اس تحریر کا اختتام کرتے ہیں:

## بیع میں زیادتی اور ترکِ جہاد

عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ، وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ، وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ، وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ، سَلَّطَ اللهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتَّى تَرْجِعُوا إِلَى دِينِكُمْ.

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: جب تم عِینَہ (یعنی سودی طریقے سے) خرید و فروخت کرنے لگو گے، اور بیلوں کی دمیں پکڑ لو گے، اور کھیتی باڑی پر ہی راضی ہو جاؤ گے، اور جہاد چھوڑ دو گے، تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کر دے گا جسے تم سے اس وقت تک دور نہیں کرے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف واپس نہ لوٹ آؤ گے۔ (سنن ابی داؤد، باب فی النہی من العینۃ، حدیث نمبر ۳۰۰۳، ضیاء القرآن پبلی کیشنز)۔

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں چار چیزوں کا ذکر فرمایا جو ذلت کا باعث بنتی ہیں:

۱۔ تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ: معاشی معاملات میں حیلہ سازی اور سودی ذہنیت کا غلبہ۔

۲۔ أَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ، / وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ: صرف دنیاوی آسائشوں اور مادی پیداوار پر قناعت کر لینا (یعنی بلند مقاصد سے محروم ہو جانا)۔

۳۔ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ: حق کی سربلندی کے لیے جدوجہد اور قربانی کا جذبہ ترک کر دینا۔

جب اسلامی بینکاری "بیع" کے نام پر سرمایہ دارانہ نظام کے آلاتِ ربا کو اپنا لیتی ہے، تو وہ اسی 'عینہ' کے زمرے میں آتی ہے جسے نبی ﷺ نے دین سے دوری اور ذلت کا سبب قرار دیا۔ یہ محض ایک 'فنانشل پراڈکٹ' نہیں، بلکہ ایک ایسی ذہنیت ہے جو امت کو حقیقی معاشی تخلیق (Innovation) سے روک کر دوسروں کے نظام کا تابع بنا دیتی ہے۔

## نوٹس و حوالہ جات

۱۔عن زيد بن أسلم قال كان الربا في الجاهلية أن يكون للرجل على الرجل حق إلى أجل فإذا حل الأجل قال أتقضي أم تربي ، فإن قضى أخذ وإلا

زاده في حقه وأخر عنه في الأجل » . ( الموطأ للإمام مالك، طبعة القاهرة، ج ٢،ص ٦٧٢).

ترجمہ:"زید بن اسلمؒ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"زمانۂ جاہلیت میں ربا اس طرح ہوتا تھا کہ ایک شخص کا دوسرے شخص پر ایک مقررہ مدت تک کوئی حق (یعنی قرض) ہوتا۔ جب مدت پوری ہو جاتی تو وہ کہتا: 'ادا کرو گے یا اضافہ کرو گے؟' پس اگر وہ ادا کر دیتا تو وہ (اپنا حق) وصول کر لیتا، اور اگر ادا نہ کرتا تو اس کے قرض میں اضافہ کر دیتا اور اس کے لیے مدت کو مزید بڑھا دیتا۔"

٢۔"قوله تعالى: { وَحَرَّمَ ٱلرِّبَا } الألف واللام هنا للعهد، وهو ما كانت العرب تفعله كما بيّناه، ثم تتناول ما حرمه رسول الله صلى الله عليه وسلم ونهى عنه من البيع الذي يدخله الربا وما في معناه من البيوع المنهيّ عنها." (الجامع لأحكام القرآن تحت تفسير الآية الكريمة).

"اللہ تعالیٰ کا فرمان: {وَحَرَّمَ الرِّبَا} (اور اس نے ربا کو حرام کیا)؛ یہاں 'الرِّبَا' پر جو 'الف اور لام' (ال) ہے، وہ 'عہد' کے لیے ہے (یعنی یہ ایک خاص اور معروف ربا کی طرف اشارہ ہے)۔ اور یہ وہی (سود) ہے جس پر عرب (زمانۂ جاہلیت میں) عمل پیرا تھے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پھر یہ (حکم) ان تمام چیزوں کو بھی شامل ہو جاتا ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا اور ان سے منع فرمایا؛ یعنی وہ تمام بیوع (خرید و فروخت کی صورتیں) جن میں ربا داخل ہو جاتا ہو، اور وہ تمام ممنوعہ بیوع جو ربا کے مفہوم میں آتی ہوں۔"

]https://www.greattafsirs.com/

امام قرطبی کی تفسیر کے تمام حوالے یہاں سے منقول ہیں]۔

٣۔https://aljam3.com/en/30682/60215/304

امام بغوی، امام ابن عربی، امام رازی اور امام جصاص کے حوالہ جات اسی مضمون سے ماخوذ ہیں۔

٤۔قوله تعالى: { وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَا } هذا من عموم القرآن، والألف واللام للجنس لا للعهد إذ لم يتقدّم بيع مذكور يُرجع إليه؛ كما قال تعالى: { وَٱلْعَصْرِ إِنَّ ٱلإِنسَانَ لَفِى خُسْرٍ } ثم استثنى { { إِلاَّ ٱلَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّالِحَاتِ } [العصر: ٢]. وإذا ثبت أن البيع عام فهو مخصّص بما ذكرناه من الربا وغير ذلك مما نُهي عنه ومنع العقد عليه؛ كالخمر والميتة وحبلَ الحَبَلة وغير ذلك مما هو ثابت في السُّنَّة وإجماع الأُمة النَّهيُ عنه. ونظيره «ٱقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ» وسائر الظواهر التي تقتضي

العمومات ويدخلها التخصيص، وهذا مذهب أكثر الفقهاء. وقال بعضهم: هو من مجمل القرآن الذي فسّر بالمحلّل من البيع وبالمحرّم فلا يمكن أن يُستعمَل في إحلال البيع وتحريمه إلا أن يقترن به بيانٌ من سُنَّة الرسول صلى الله عليه وسلم، وإن دلّ على إباحة البيوع في الجملة دون التفصيل. هذا فرق ما بين العموم والمُجْمَل. فالعموم يدل على إباحة البيوع في الجملة والتفصيل ما لم يخصّ بدليل. والمجمل لا يدل على إباحتها في التفصيل حتى يقترن به بيان. والأوّل أصح. والله أعلم.(الجامع لأحكام القرآن، تحت تفسير الآية الكريمة).

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد: {وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَا} (اور اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربا کو حرام)؛ یہ قرآن کے 'عموم' (General Rule) میں سے ہے۔ یہاں (البیع میں) 'الف اور لام' (ال) جنس کے لیے ہیں، نہ کہ عہد کے لیے؛ کیونکہ اس سے پہلے کسی ایسے مخصوص سودے کا ذکر نہیں گزرا جس کی طرف اشارہ مقصود ہو۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: { وَٱلْعَصْرِ إِنَّ ٱلْإِنسَانَ لَفِى خُسْرٍ} (قسم ہے زمانے کی، بے شک انسان خسارے میں ہے)؛ پھر اس سے استثناء فرمایا: {إِلَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟} (سوائے ان کے جو ایمان لائے)۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ 'البیع' (تجارت) ایک عام حکم ہے، تو اس کی تخصیص (Restriction) ان تمام صورتوں سے ہو گی جنہیں ربا قرار دیا گیا یا جن سے منع کیا گیا اور جن پر عقد (معاہدہ) کرنا ممنوع ہے؛ جیسے شراب، مردار، 'حبل الحبلہ' (حاملہ جانور کے پیٹ کے بچے کی بیع) اور وہ تمام صورتیں جن کی ممانعت سنتِ نبوی اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ اس کی مثال 'مشرکین کو قتل کرو' (جیسے عمومی احکام) کی سی ہے جہاں الفاظ عموم کا تقاضا کرتے ہیں مگر ان میں (دیگر دلائل سے) تخصیص داخل ہو جاتی ہے۔ فقہاء کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔

بعض نے کہا کہ یہ قرآن کے 'مجمل' (Ambiguous) احکام میں سے ہے، جس کی تفسیر سنتِ رسول ﷺ کے ذریعے حلال اور حرام بیوع کی وضاحت سے ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت سے بیع کے حلال یا حرام ہونے کا استدلال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سنت سے اس کا بیان نہ مل جائے، اگرچہ یہ اجمالی طور پر بیوع کی اباحت پر دلالت کرتی ہے۔ 'عموم' اور 'مجمل' کے درمیان یہی فرق ہے: 'عموم' تمام جزئیات اور تفصیلات میں بیع کی اباحت پر دلالت کرتا ہے جب تک کہ کسی دلیل سے اسے مخصوص نہ کر دیا جائے، جبکہ 'مجمل' تفصیلات پر دلالت نہیں کرتا جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی وضاحت (بیان) نہ مل جائے۔ اور پہلا قول (کہ یہ 'عام' ہے) زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔"

یہاں امام قرطبی ایک نہایت گہرا اصولی موقف بیان فرمارہے ہیں:

"الربا" (پہلی آیت میں) = عہد

"البیع" = جنس

آیت = عام

سنت = مخصِّص

نہ کہ مبیّنِ اجمال

یہ فرق دراصل دلالتِ الفاظ کے باب میں "عام" اور "مجمل" کی بنیادی بحث پر مبنی ہے۔

۵-یہ امام قرطبی کی تعبیر ہے:البيع في اللغة مصدر باع كذا بكذا ، أي دفع عوضا وأخذ معوضا. وهو يقتضي بائعا وهو المالك أو من ينزل منزلته، ومبتاعا وهو الذي يبذل الثمن، ومبيعا وهو المثمون وهو الذي يبذل في مقابلته الثمن. وعلى هذا فأركان البيع أربعة: البائع والمبتاع والثمن والمثمن (الجامع لأحكام القرآن، تحت تفسير الآية ٢٧٥، سورة البقرة).

٦-قوله تعالى: فمن جاءه موعظة من ربه قال جعفر بن محمد الصادق رحمهما الله: حرم الله الربا ليتقارض الناس. وعن ابن مسعود عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: قرض مرتين يعدل صدقة مرة أخرجه البزار، وقد تقدم هذا المعنى مستوفى. وقال بعض الناس: حرمه الله لأنه متلفة للأموال مهلكة للناس (امام قرطبی تحت تفسير الآية الكريمة ٢٧٥، سورة البقرة).

۷-بیع کے ان چار ارکان کی موجودگی ہی وہ حدِ فاصل ہے جو تجارت کو سود سے جدا کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ بینکاری میں جب 'مرابحہ' یا 'لیزنگ' کے نام پر معاہدے ہوتے ہیں، تو اکثر 'مثمن' (مبیع) کا وجود محض کاغذی ہوتا ہے اور خطرہ (Risk) مکمل طور پر مشتری کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ امام جصاصؒ اور ابن رشدؒ کی تصریحات کے مطابق، اگر بیع کے ان ارکان میں سے مبیع (Asset) کا حقیقی وجود اور بائع کا اس پر 'ضمان' ختم ہو جائے، تو وہ معاملہ اپنی روح میں 'ربا' بن جاتا ہے۔

٨-جاء في الموسوعة الفقهية الكويتية: قال ابن عبد البر -رحمه الله: وكل زيادة في سلف أو منفعة ينتفع بها المسلف فهي ربا، ولو كانت قبضة من علف، وذلك حرام إن كان بشرط، وقال ابن المنذر: أجمعوا على أن المسلف إذا شرط على المستسلف زيادة أو هدية، فأسلف على ذلك، أن أخذ الزيادة على ذلك ربا. واستدلوا على ذلك: بما روي من النهي عن كل قرض جر نفعا، أي للمقرض.

ترجمہ: "ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرض کے معاملے میں ہر وہ اضافہ یا منفعت جس سے قرض دینے والا فائدہ اٹھائے، وہ ربا ہے، چاہے وہ ایک مٹھی چارہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ اس صورت میں حرام ہے جب وہ (فائدہ) شرط کے طور پر مقرر کیا گیا ہو۔ ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر قرض دینے والا قرض لینے والے پر کسی اضافے یا ہدیے کی شرط عائد کرے اور اس بنیاد پر قرض دے، تو اس اضافے کو لینا ربا ہے۔ اور انہوں نے اس پر اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں ہر اس قرض سے منع کیا گیا ہے جو قرض دینے والے کے لیے نفع کھینچ لائے۔"

بحوالہ

https://www.islamweb.net/ar/fatwa/392794/%D9%83%D9%84%D8%B2%D9%8A%D8%A7%D8%AF%D8%A9D9%85%D8%B4%D8%B1%D9%88%D8%B7%D8%A9-%D8%B9%D9%84%D9%89-%D8%A7%D9%84%D9%82%D8%B1%D8%B6%D8%B1%D8%A8%D8%A7

۹- https://isla.mw/amcnb1

۱۰- https://isla.mw/a1mlsn

ومن باب ترك قول من قال: لا ربا إلا في النسيئة

(قول أبي نضرة : سألت ابن عمر ، وابن عباس عن الصرف فلم يريا به بأسا ) يعني به: صرف الذهب بالذهب، أو الفضة بالفضة. سألهما عن التفاضل بينهما، فأفتياه بالجواز أخذا منهما بظاهر قوله صلى الله عليه وسلم: ( إنما الربا في النسيئة ) فإن هذا اللفظ ظاهره الحصر، فكأنه قال: لا ربا إلا في النسيئة. وهكذا وقع هذا اللفظ في البخاري ، وهو مقتضى قوله هنا: ( لا ربا فيما كان يدا بيد ) فينتفي ربا الفضل. وقد قدمنا: أن هذا الخلاف شاذ، متقدم، مرجوع عنه، كما قد نص عليه هنا من رجوع ابن عمر ، وابن عباس عنه. وممن قال بقولهما من السلف: عبد الله بن الزبير ، وزيد بن أرقم ، وأسامة بن زيد . ولا شك في معارضة هذا الحديث لحديث عبادة ، وأبي سعيد ، وغيرهما. فإنها نصوص في إثبات ربا الفضل.

ولما كان كذلك اختلف العلماء في كيفية التخلص من ذلك على أوجه، أشبهها وجهان:

أحدهما: أن حديث ابن عباس منسوخ بحديث عبادة وأبي سعيد ، غير أنهم لم ينقلوا التاريخ نقلا صريحا، وإنما أخذوه من رجوع ابن عباس عن ذلك، ومن عمل الجمهور من الصحابة وغيرهم من علماء المدينة على خلاف ذلك.

قلت: وهذا لا يدل على النسخ، وإنما يدل على الأرجحية.

وثانيهما: إن قوله: ( لا ربا إلا في النسيئة ). إنما مقصوده نفي الأغلظ الذي حرمه الله بنص القرآن، وتوعد عليه بالعقاب الشديد، وجعل فاعله محاربا لله، وذلك بقوله تعالى: الذين يأكلون الربا لا يقومون إلا كما يقوم الذي يتخبطه الشيطان من المس [البقرة: ٢٧٥] إلى آخر الآيات، وما كانت العرب تعرف ربا إلا ذلك، فكانت إذا حل دينها قالت للغريم: إما أن تقضي، وإما أن تربي؛ أي: تزيد في الدين. وهذا هو الذي نسخه النبي صلى الله عليه وسلم يوم عرفة لما قال: (ألا إن كل ربا موضوع، وإن أول ربا أضعه ربانا ربا عباس ). وهذا كما تقول العرب: إنما المال الإبل، وإنما الشجاع علي ، وإنما الكريم يوسف ابن نبي الله. ولا عالم في البلد إلا زيد . ومثله كثير. يعنون بذلك نفي الأكبر والأكمل، لا نفي الأصل. وهذا واضح. ومما يقرب فيه هذا التأويل جدا رواية من روى: (لا ربا فيما كان يدا بيد) أي: لا ربا كثير أو عظيم، كما قال: (لا صلاة لجار المسجد إلا في المسجد) أي: لا صلاة كاملة.

قلت: ويظهر لي وجه آخر وهو حسن؛ وذلك: أن دلالة حديث ابن عباس على نفي ربا الفضل دلالة بالمفهوم، ودلالة إثباته دلالة بالمنظوم. ودلالة المنظوم راجحة على دلالة المفهوم باتفاق النظار، والحمد لله.

باب: ان لوگوں کے قول کو ترک کرنے کا بیان جو کہتے ہیں کہ ربا صرف ادھار (نسیئہ) میں ہے۔

"ابو نضرہؒ کا قول کہ میں نے ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے 'صرف' (سونے چاندی کے تبادلے میں تفاضل) کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اس میں حرج نہ سمجھی؛ یعنی انہوں نے سونے کی سونے سے یا چاندی کی چاندی سے کمی بیشی (تفاضل) کے ساتھ بیع کو جائز قرار دیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے فرمان: 'إنما الربا في النسيئة' (ربا تو صرف ادھار میں ہے) کے ظاہر سے استدلال کیا، کیونکہ یہ لفظ

حصر کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، یہ اختلاف 'شاذ' (ایسا قول جو جمہور کے خلاف ہو) تھا، ابتدائی دور کا تھا، جیسا کہ یہاں ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کے رجوع کی صراحت موجود ہے۔ اور سلف میں سے ان دیگر حضرات کا رجوع بھی منقول ہے جو ابن عباس وغیرہ — جیسے عبد اللہ بن زبیرؓ، زید بن ارقمؓ اور اسامہ بن زیدؓ — کے ہم نوا تھے۔

اس حدیث اور ربا الفضل کو ثابت کرنے والی احادیث (عبادہؓ اور ابو سعیدؓ کی روایات) کے درمیان تعارض کو حل کرنے کے لیے علماء نے کئی توجیہات پیش کیں، جن میں دو زیادہ قوی ہیں:

پہلی توجیہ: حدیثِ ابن عباس (یعنی حدیثِ اسامہ) کو حدیثِ عبادہ اور ابو سعیدؓ سے منسوخ سمجھا جائے۔ اگرچہ تاریخِ نسخ صراحتاً منقول نہیں، مگر ابن عباسؓ کے رجوع اور جمہور صحابہ کے عمل سے اس کا استدلال کیا گیا۔

لیکن مصنف فرماتے ہیں: یہ نسخ پر نہیں بلکہ ترجیح پر دلالت کرتا ہے۔

دوسری توجیہ: "لا ربا إلا في النسيئة" سے مراد اس ربا کی نفی نہیں جو مطلقاً پایا جاتا ہے، بلکہ اس شدید اور عظیم ربا کی طرف اشارہ ہے جسے قرآن میں صراحتاً حرام قرار دیا گیا اور جس پر سخت وعید آئی۔ عرب اسی ربا (ربا النسیئہ) کو جانتے تھے کہ جب قرض کی مدت پوری ہوتی تو کہتے: یا ادا کرو یا اضافہ کرو۔

یہ اسلوب ویسا ہی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: "مال تو بس اونٹ ہیں"

یا

"عالم تو صرف زید ہے"

جس سے مراد اصلِ مال یا اصلِ علم کی نفی نہیں بلکہ اس کے کامل یا غالب ترین مصداق کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

یعنی اصل اور بڑا سود تو ادھار میں ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نقد میں زیادتی سود نہیں (جیسے 'مسجد کے پڑوسی کی نماز مسجد کے بغیر نہیں ہوتی' سے مراد 'کامل نماز' کی نفی ہے)۔

تیسری (امام قرطبیؒ کی اپنی) توجیہ: ابن عباسؓ کی حدیث سے ربا الفضل کی نفی 'دلالتِ مفہوم' (Inferred meaning) سے ہو رہی ہے، جبکہ ربا الفضل کو ثابت کرنے والی احادیث 'دلالتِ منظوم'/منطوق (Explicit text) سے ہیں۔ اور اہلِ اصول کے اتفاق سے منطوق مفہوم پر راجح ہوتا ہے۔"

# معیشت، معاشرت، سیاست

# پاکستان میں امریکی اثر ورسوخ کے خلاف موجودہ حالات میں دینی جماعتوں کا انقلابی لائحۂ عمل: ایک جامع پالیسی اسٹیٹمنٹ

سید محمد یونس قادری

## موجودہ صورتحال کا تجزیہ اور تاریخی پس منظر

پاکستان پر امریکی اثر ورسوخ کی بنیاد ۱۹۵۰ کی دہائی میں رکھی گئی، جب جنرل ایوب خان نے ۱۹۵۴ میں امریکی حکام سے رابطے شروع کیے، جس کے نتیجے میں بعد ازاں ۱۹۵۸ کے مارشل لاء کا راستہ ہموار ہوا۔ اس کے بعد پاکستان، سینٹو اور سیٹو جیسے امریکی حمایت یافتہ معاہدوں کا حصہ بنا اور امریکہ کو خفیہ اڈے فراہم کیے گئے۔

ماہرین کے مطابق، پاکستان کے فوجی اور سول حکمرانوں نے ملک کو امریکی مفادات کے تابع رکھا۔ اس کی تازہ مثال ۹/۱۱ کے بعد پرویز مشرف کا امریکی حکم پر پاکستان کو "امریکی جنگ" میں شامل کرنا اور ہزاروں مجاہدین کو امریکہ کے حوالے کرنا ہے۔

حالیہ دنوں میں امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ غزہ امن معاہدے میں شرکت اور پاک افغان سرحد پر جاری کشیدگی جیسے عوامل نے صورتحال کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ یہ سب عوامل واضح کرتے ہیں کہ پاکستان کو امریکی کالونی بننے سے روکنے کے لیے دینی جماعتوں کا کردار انتہائی اہم ہو گیا ہے۔

## دینی جماعتوں کا تاریخی کردار اور اتحاد کی روایت

پاکستان کی دینی جماعتیں ماضی میں بھی اہم مواقع پر متحد ہو کر ریاستی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۷۷ میں پاکستان نیشنل الائنس کے نام سے نو دینی اور قدامت پسند جماعتوں کا اتحاد قائم ہوا، جس میں جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور دیگر جماعتیں شامل تھیں۔

اس کے بعد متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) نے ۲۰۰۲ کے انتخابات میں تاریخی کامیابی حاصل کی اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حکومتی اتحاد میں شامل ہوئی۔

ان تاریخی مثالوں سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب دینی جماعتیں متحد ہوتی ہیں تو وہ نہ صرف ریاست پر دباؤ ڈال سکتی ہیں بلکہ عوامی حمایت حاصل کر کے اپنا مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

## انقلابی لائحہ عمل

### پہلا مرحلہ: فکری و نظریاتی بنیادوں کی تشکیل

اس انقلابی جدوجہد کی پہلی منزل فکری و نظریاتی بنیادوں کی تشکیل ہے۔ اس سلسلے میں تمام دینی جماعتوں کو مل کر ایک متفقہ بیانیہ تیار کرنا ہو گا، جس میں امریکہ کو "عالمی دہشت گرد" قرار دیا جائے۔ پاکستان کی مکمل خود مختاری اور اسے امریکی کالونی بننے سے بچانا اس بیانیے کا مرکزی نکتہ ہونا چاہیے۔

اس مقصد کے لیے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کی ایک عظیم الشان قومی کانفرنس بلائی جائے، جس میں امریکی مداخلت کے خلاف متفقہ قرارداد منظور کی جائے اور ایران کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے لیے علماء کا وفد تیار کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ، ہر ضلع میں علماء اور خطیبوں کی تربیتی ورکشاپس منعقد کی جائیں، جہاں انہیں امریکی عزائم سے آگاہی، ایران اور افغانستان کی حمایت کے لیے اسلامی دلائل، اور سوشل میڈیا کے مؤثر استعمال کی تربیت فراہم کی جائے۔

### دوسرا مرحلہ: تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل اور متحدہ محاذ کا قیام

تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل اس لائحہ عمل کا دوسرا اہم مرحلہ ہے۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، تحریک لبیک پاکستان اور دیگر تمام دینی مکاتب فکر کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم "تحریک تحفظ پاکستان و نفاذ شریعت" کے نام سے قائم کیا جائے۔

اس پلیٹ فارم کا سربراہ تمام جماعتوں کی مشاورت سے مقرر کیا جائے اور ہر جماعت کے

نمائندوں پر مشتمل ایک مرکزی کمیٹی بنائی جائے۔ صوبائی اور ضلعی سطح پر بھی کمیٹیاں قائم کی جائیں اور تحصیل ویونین کونسل کی سطح تک نیٹ ورک کو پھیلایا جائے۔

نوجوانوں اور خواتین کے لیے علیحدہ ونگز قائم کیے جائیں، "اسلامی طلبہ تحریک" کو فعال کیا جائے، اور وکلاء، ڈاکٹرز، انجینئرز جیسے پیشہ ور افراد کی کمیٹیاں بنائی جائیں تاکہ ہر طبقۂ فکر اس تحریک میں شامل ہو سکے۔

## تیسرا مرحلہ: عوامی بیداری اور میڈیا مہم

عوامی بیداری کے فروغ کے لیے مساجد اور مدارس کو مؤثر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ جمعہ کے خطبات میں امریکی جرائم اور ایران کی مظلومیت کو خصوصی طور پر موضوع بنایا جائے، اور نمازِ جمعہ سے قبل مختصر احتجاجی مظاہرے بھی کیے جائیں۔

مدارس کے نصاب میں "امریکی مخالفت کا سبق" شامل کیا جائے تاکہ نئی نسل کو امریکی عزائم سے آگاہی مل سکے۔

میڈیا مہم کے تحت سوشل میڈیا پر "امریکی دہشت گردی" کے عنوان سے ہیش ٹیگ مہم چلائی جائے، کم بجٹ میں ٹی وی پروگرام تیار کیے جائیں گے اور مقامی اخبارات میں مضامین اور اشتہارات شائع کیے جائیں۔

عوامی رابطہ مہم کے تحت گھر گھر جا کر پمفلٹ تقسیم کیے جائیں، چھوٹے اجتماعات منعقد کیے جائیں، اور ایران جانے والے پاکستانی زائرین کو بھی اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔

## چوتھا مرحلہ: ریاست پر دباؤ کے عملی اقدامات

ریاست پر دباؤ ڈالنے کے لیے کثیر الجہت حکمت عملی اپنائی جائے۔ قانون سازی کے میدان میں پارلیمنٹ سے امریکی مداخلت کے خلاف قرارداد پیش کرنے کا مطالبہ کیا جائے، امریکی اڈوں سے متعلق معاہدوں کی منسوخی کے لیے تحریک چلائی جائے، اور ایران کے ساتھ دفاعی معاہدے کی منظوری کا مطالبہ کیا جائے۔

احتجاجی سرگرمیوں کے سلسلے میں ماہانہ بنیادوں پر مخصوص دنوں میں ملک گیر احتجاج کیے جائیں، امریکی سفارت خانے اور قونصل خانوں کے باہر دھرنے دیے جائیں، اور ڈی چوک اسلام آباد میں ایک عظیم الشان اجتماع منعقد کیا جائے۔

اگر یہ اقدامات مؤثر ثابت نہ ہوں تو وفاقی دارالحکومت کی طرف لانگ مارچ کیا جائے، اہم شاہراہوں اور سرکاری عمارتوں کا پرامن گھیراؤ کیا جائے، اور ملک گیر ہڑتالوں کا انعقاد کیا جائے تاکہ ریاست اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جائے۔

### پانچواں مرحلہ: ایران کے ساتھ عملی یکجہتی کے اقدامات

ایران اور افغانستان کے ساتھ یکجہتی کے عملی اقدامات کے تحت علماء کے وفود کا ایران اور افغانستان کا باقاعدہ دورہ کرایا جائے، جہاں ایرانی اور افغانی حکام سے ملاقاتیں کی جائیں اور پاک–ایران و پاک–افغانستان دوستی کمیٹیاں قائم کی جائیں۔

اقتصادی تعاون کی حمایت کے لیے ایران–پاکستان گیس پائپ لائن کی تکمیل کے حق میں ریلیاں نکالی جائیں، ایرانی اور افغانی مصنوعات کے استعمال کی ترغیب دی جائے، اور سرحدی منڈیوں (بارڈر مارکیٹس) کے فروغ کے لیے آواز اٹھائی جائے۔

مشترکہ ثقافتی اسلامی پروگراموں کے تحت پاک–ایران–افغانستان مشترکہ ثقافتی میلے منعقد کیے جائیں، اور فارسی زبان کے فروغ کے لیے کلاسز کا بھی انعقاد کیا جائے۔

## ممکنہ چیلنجز اور ان کا مؤثر مقابلہ

اس انقلابی جدوجہد کو کئی چیلنجز کا سامنا ہو سکتا ہے جن کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کرنا ہو گا۔ ریاستی اداروں کی ممکنہ مزاحمت کے مقابلے میں پرامن جدوجہد جاری رکھی جائے گی، عوامی حمایت حاصل کی جائے گی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان میں امریکی استعمار کے خلاف تحریک کی وکالت کی جائے گی۔

جماعتی اختلافات سے نمٹنے کے لیے صرف ان مشترکہ نکات پر توجہ مرکوز رکھی جائے گی جن پر تمام جماعتیں متفق ہیں، اور اختلافی امور کو بعد کے مراحل کے لیے مؤخر کر دیا جائے۔

انتخابی سیاست میں ممکنہ ناکامی کے پیش نظر عوامی تحریکوں پر زیادہ توجہ دی جائے اور انتخابات کے بجائے ریفرنڈم اور عوامی رائے شماری کا مطالبہ کیا جائے۔

مغربی میڈیا کے پروپیگنڈے کے مقابلے میں حقائق پر مبنی میڈیا مہم چلائی جائے، سوشل میڈیا پر مؤثر موجودگی قائم کی جائے، اور غیر جانبدار بین الاقوامی مبصرین کو دعوت دی جائے تاکہ دینی جماعتوں کو دہشت گرد یا شدت پسند قرار دینے کی امریکی کوششوں کو ناکام بنایا جاسکے۔

## معاشی پہلو اور شفاف مالیاتی نظام

کسی بھی عظیم تحریک کی کامیابی کے لیے ایک مضبوط اور شفاف مالیاتی نظام ناگزیر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں تمام جماعتیں مل کر فنڈ اکٹھا کرنے کا ایک شفاف نظام قائم کریں، جس کے تحت چندے کی باقاعدہ رسیدیں جاری کی جائیں اور آڈٹ واحتساب کا باقاعدہ نظام بھی قائم کیا جائے۔

عطیات دینے والوں کو مکمل اعتماد دلایا جائے گا کہ ان کا دیا ہوا ہر پیسہ تحریک کے فروغ اور عوامی بہبود کے کاموں پر خرچ ہوگا۔ اس کے علاوہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں سے بھی رابطہ کیا جائے گا تاکہ وہ اس تحریک میں مالی تعاون کر سکیں۔

## بین الاقوامی سطح پر رابطے اور سفارتی کوششیں

اس تحریک کو بین الاقوامی سطح پر بھی وسعت دی جائے گی۔ ترکی، قطر اور ملائیشیا جیسے ممالک کی دینی اور سیاسی جماعتوں سے رابطہ کیا جائے گا تاکہ عالمی سطح پر امریکی مخالفت کا ایک مؤثر نیٹ ورک تشکیل دیا جاسکے۔

مسلم ممالک کی دینی جماعتوں کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا جائے گا اور مختلف بین الاقوامی فورمز پر پاکستانی مؤقف کو مؤثر انداز میں پیش کیا جائے گا۔

اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کے اجلاسوں میں پاکستان کے علماء کے وفود شرکت کریں

گے اور امریکی جارحیت کے خلاف آواز بلند کریں گے۔

## نتیجہ اور عملی سفارشات

پاکستان کی دینی جماعتیں اگر مذکورہ بالا جامع لائحہ عمل پر متحد ہو کر عمل کریں تو وہ نہ صرف امریکی اثر ورسوخ کو ختم کر سکتی ہیں بلکہ ایران جیسے اسلامی ممالک کے ساتھ مضبوط تعلقات استوار کر کے خطے میں ایک نیا اسلامی اتحاد بھی تشکیل دے سکتی ہیں۔

اس مقصد کے لیے تمام جماعتوں کی متفقہ قیادت کا انتخاب کیا جائے اور پرانی قیادت کے ساتھ نوجوانوں کو بھی شامل کیا جائے۔ انقلابی جدوجہد کے پانچ ستون—ایمان باللہ، تمام مکاتبِ فکر کا اتحاد، مشکلات میں ثابت قدمی، مسلسل اور منظم عمل، اور جان ومال کی قربانی کا جذبہ—ہر مرحلے میں پیشِ نظر رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کو امریکی غلامی سے نجات دے اور اسے ایک حقیقی اسلامی ریاست بنائے، اور ایران اور افغانستان جیسے برادر ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کو مزید مضبوط کرے تاکہ ہم مل کر عالمی استعمار کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کر سکیں۔

# کیا جماعت اسلامی کو سیاست سے پہلو تہی اختیار کرنی چاہیے؟

جاوید اکبر انصاری

مخلصین دین کے کچھ حلقے جن میں جماعت اسلامی کے حمایتی بھی شامل ہیں جماعت کو سیاسی عمل سے قدرے پہلو تہی اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس مضمون میں میں کوشش کروں گا کہ اس استدلال کا جائزہ لوں۔ مضمون کے پہلے حصے میں ان مخلصین دین کے اس استدلال کی وضاحت پیش کی جائے گی اور دوسرے حصے میں اس کا نقد اور ممکنہ متبادل طریقہ بیان کیا جائے گا۔

## مخلصین کا استدلال

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد کا مرکزی نکتہ تعلیم، تربیت اور تزکیۂ نفس کے عمل کا پھیلاؤ تھا۔ اس انفرادی اصلاح اور تبلیغ کے نتیجے میں اسلامی معاشرت و ریاست خود بخود وجود میں آگئی۔

۲۔ سیاست میں حصہ لے کر جماعت اسلامی اپنے اندر للّٰہیت اور تقویٰ کا وہ معیار قائم نہ رکھ سکی جو ایک اسلامی جماعت کو مطلوب ہونا چاہیے۔ وہ ایک عام سیاسی جماعت بنتی جا رہی ہے یعنی سرمایہ دارانہ ریاست جماعت پر قبضہ کر رہی ہے۔

۳۔ جماعت سرمایہ دارانہ نظام کی تسخیر نہ کر سکی۔ اس کا سیاسی عمل لاحاصل رہا ہے۔ وہ ہر انتخاب میں بری طرح شکست کھاتی رہی ہے اور ہم اس راہ پر چلتے رہے تو آئندہ بھی کامیابی کی امید نہیں کی جاسکتی۔

۴۔ مولانا مودودی ۱۹۷۵ء کے بعد سے سیاسی عمل میں شمولیت سے مایوس ہو گئے تھے اور پٹھانکوٹ میں اختیار کردہ طریقۂ کار کو دوبارہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن شوریٰ نے ان کی بات نہیں مانی۔

## ہمارا موقف

ا۔ یہ درست ہے کہ تربیت اور تزکیہ ہی وہ عمل ہے جس سے اسلامی معاشرت وجود میں آتی ہے۔ لیکن اس عمل سے اسلامی ریاست وجود میں نہیں آتی۔ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ہجرت اور جہاد ضروری ہے۔ نہ اسلامی معاشرت خود بخود اسلامی ریاست کو جنم دیتی ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے یہ ثابت ہے۔ علماء برصغیر نے سیرت پاک کے اس پہلو سے اس لیے سہو نظر کیا ہے کہ انہوں نے (یا ان کی غالب اکثریت نے) سامراج سے مصالحت کر رکھی ہے اور سامراج کے سیاسی غلبے کے تناظر میں اپنے دعوتی کام کو منظم کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں بھی دارالندوہ کا بائیکاٹ کر کے اور مسلمانوں کے تمام معاملات کی سرپرستی قبول فرما کر ایک ریاست درون ریاست بنائی تھی۔ اس ریاست درون ریاست کی مخالفت کی وجہ سے کفار کی شدید مزاحمت وجود میں آئی ورنہ حنفاء تو پہلے بھی مکے میں تھے اور ہجرت کے بعد بھی رہے[۱]۔

مدینہ میں ریاست ہی تھی جس نے تنفیذ شریعت کو ممکن بنایا۔ جنگ بدر میں فتح کے بعد ہی کفار کی اکثریت مشرف بہ اسلام ہوئی اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جہاد کے بعد ہی باغی قبائل کا فتنہ رفع کر کے اسلامی ریاست کا اقتدار بحال کیا اور جہاد ہی کے ذریعے مشرق وسطیٰ میں اسلام پھیلا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرت دعوت و تبلیغ سے مستحکم ہوتی ہے لیکن اسلامی معاشرت کا حدود اربعہ اسلامی ریاست کا اقتدار ہی متعین کرتا ہے۔ اسلامی ریاست اسلامی معاشرت اور انفرادیت کی لازمی پشت پناہ ہوتی ہے۔ اپنی قانون سازی کے نتیجے میں اسلامی ریاست وہ نظم اجتماعی مہیا کرتی ہے جس میں اسلامی انفرادیت و معاشرت پھل پھول سکیں۔ ایک غیر اسلامی ریاست کا نظم اجتماعی اسلامی معاشرت اور اسلامی انفرادیت کو مستقلاً کچلنے کے درپے رہتا ہے[۲]۔

۲۔ یہ درست ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان اور کارکنان میں اخلاقی اور روحانی زوال آیا ہے لیکن اس زوال کا واحد سبب سیاسی عمل میں شرکت نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو تربیتی لٹریچر اپنے ارکان اور کارکنوں کو جماعت فراہم کرتی ہے وہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے نہایت کمزور ہے اور جماعت کے تربیتی پروگراموں میں تزکیۂ نفس کے عمل کو فروغ دینے کی بہت کم گنجائش ہے اور صوفیائے عظام کے ملفوظات سے استفادہ بالکل ناپید ہے۔ ذکر کا رواج عام نہیں اور سیاسی عمل کو روحانی اور ثقافتی عمل میں پیوست کرنے کی کوئی کوشش موجود نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم مولانا مودودی کی فکر کو علمائے جہاد حضرت فضل حق خیر آبادی، حضرت امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت محمود الحسن وغیرہم کی فکر سے مربوط کرنے میں ناکام رہے۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے ہم نے پاپولرزم کا سہارا لیا اور بتدریج سرمایہ دارانہ اخلاقیات اور روحانیت ہم میں عام ہونے لگیں[۳]۔

۳۔ ہم انتخابی عمل میں عموماً ناکام رہے۔ اس ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے فطری حلقۂ اثر سے روابط استوار کرنے کی کوشش نہ کی۔ یہ فطری حلقۂ اثر مخلصین دین پر مشتمل ہے جو ملک کی دس فیصد آبادی پر مشتمل ہے یعنی دو ڈھائی کروڑ افراد جو نہ متحرک ہیں نہ منظم۔ جو مخلصین دین منظم ہیں ان کا تعلق روایتی، مسلکی جماعتوں سے ہے۔ ہم نے اس بات کو نظر انداز کیا کہ روایتی اور مسلکی جماعتیں پاکستان میں تحفظ دین کی تحریک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود یہ مسلکی اور روایتی جماعتیں ہی ہیں جو مخلصین دین کی نمایندہ جماعتیں ہیں جو اسلامی رسوم و رواج اور اسلامی معاشرت کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان کے ذریعے ہی انقلاب اسلامی کا پیغام عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ براہ راست عوام سے تخاطب لاحاصل ہے کیونکہ نوے فی صد عوام غلبۂ دین کے متمنی اور خواہاں نہیں۔ اپنے بنیادی حلقۂ اثر کو نظر انداز کر کے ہم نے روایتی انتخابی عمل کا سہارا لیا اور اب پاپولرزم سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ہم سرمایہ دارانہ عدل اور عوامی سرمایہ دارانہ حقوق کے فروغ کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ ریاست جماعت پر قبضہ کر رہی

ہے اور جماعت ایک سوشل ڈیموکریٹ پارٹی بنتی چلی جارہی ہے۔ ہم اسلام کی سرمایہ دارانہ تشریح مرتب کررہے ہیں۔ ہم اسلام سے دور اور عوام کے قریب ہوتے جارہے ہیں[۴]۔

۴۔ ہم مولانا مودودی کے علمی معذرت خواہ(apologist)ہیں اور ان کے اجتہادات ہی کی تشریح مرتب کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ مولانا مودودی ہمارے مرشد ہیں۔

مودودی پیارا مودودی

مودودی تارہ مودودی

اک امرت دھارا مودودی

ہم سب کا سہارا مودودی

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے مرشد کے کام میں پائی جانے والی غلطیوں کو صحیح اور خامیوں سے خالی سمجھیں۔ علمی معذرت خواہ(apologist)کا اصل کام ان غلطیوں اور خامیوں کو رفع کرنا ہوتا ہے۔ مولانا مودودی کا بنیادی اجتہاد یہ ہے کہ دور حاضر میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد غلبۂ دین کے لیے لازمی ہے اور اس کو دعوتی عمل میں تقدیم دینی چاہیے۔ اسی غرض سے انہوں نے جماعت اسلامی بنائی جس کا اصل مقصد غلبۂ دین یعنی قیام ریاست اسلام کی جدوجہد ہے۔

ہماری رائے میں مولانا مودودی نے کبھی اس رائے سے رجوع نہیں فرمایا اور اگر (بقول چند مخلصان دین) مولانا مودودی ۱۹۷۵ء کے بعد سے اس رائے کو تبدیل کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے تو یہ ان کی غلطی تھی۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جماعت بھی دوسری روایتی جماعتوں کی طرح تحفظ دین پر توجہ مرکوز کرے گی اور غلبۂ دین کی جدوجہد سرمایہ دارانہ نظم اجتماعی میں ضم ہو جائے گی۔ اس صورت میں مولانا مودودی کے دونوں کلیدی اجتہادات (اسلام ایک مکمل طرز حیات اور نظام زندگی ہے اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے) پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

تحفظ دین کا فریضہ روحانی، مسلکی جماعتیں بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ ان کے کام کو دہرانے

(replicate) سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تحفظ دین اور غلبۂ دین کی جدوجہد کو ایک لڑی میں پرویا جائے۔ جماعت کی غلبۂ دین کی جدوجہد مسلکی جماعتوں کی تحفظ دین کی جدوجہد میں پیوست (embedded) ہو۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو ساری جماعتوں کو ساتھ لے کے چلو [۵]

۵۔ جماعت اسلامی اصولاً ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے۔ اس کا بنیادی مقصد غلبۂ دین یعنی قیام ریاست اسلامی ہے۔ اگر اس نے اپنے اس فریضے سے کوتاہی کی تو اپنی امتیازی خصوصیت سے محروم ہو جائے گی۔ غلبۂ دین نہ سیاست کی اولیت کو ترک کر کے حاصل ہو سکتا ہے نہ پاپولر سوشل ڈیموکریٹ منہج اختیار کر کے۔ ان دونوں طریقوں کو اختیار کرنے کا مطلب ایک ہی ہے یعنی اسی سامراجی مصالحت کو فروغ دینا جو علمائے برصغیر نے انیسویں صدی کے آخر سے اپنائی ہوئی ہے۔

آج چند مخلصین دین غلبۂ دین سے اتنے مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ جماعت کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ اپنے اندر سے ایک سیکولر جماعت بر آمد کرے جو اس کے سیاسی عمل کی اجارہ دار ہو۔ یہ سرمایہ دارانہ ریاستی نظام اجتماعی میں ضم ہونے کا موثر وسیلہ ہے جو کہ تیونس، اردن، انڈونیشیا اور مصر کے تجربات سے ثابت ہے۔ پاپولر سیاست بھی جماعت پر سرمایہ دارانہ ریاستی غلبے کے تسلط کا ذریعہ بن رہی ہے۔

جماعت کا مستقبل نہ سیاست کی تقدیم کو رد کرنے میں ہے نہ پاپولسٹ سیاست کو فروغ دینے میں۔ جماعت کو ایک انقلابی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے جس کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہوں:

۱۔ عوام سے براہ راست تخاطب کی روش ترک کی جائے۔

۲۔ ہمارا خطاب اپنے بنیادی حلقۂ اثر یعنی مخلصین دین سے ہو۔

۳۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسلکی جماعتوں اور روایتی گروہوں کا تعاون حاصل کریں

اور ان کے تبلیغی اور تعلیمی جدوجہد سے تسخیر ریاست کی اپنی جدوجہد کو مربوط کریں۔

۴۔ اس تعاون کی بنیاد پر ہم ملک بھر میں مساجد اور مدارس کا ایسا نیٹ ورک قائم کریں جس کے ذریعے مخلصین دین کی قیادت میں عوام منظم اور متحرک کیے جا سکیں۔

۵۔ اس نیٹ ورک کی کارفرمائی کا مقصد اقتدار کا ریاستی اداروں سے مخلصین دین کے ہاتھوں میں منتقل ہونا ہو۔

۶۔ ہم سرمایہ دارانہ نظم ریاست میں شرکت کی کوششیں ترک کر دیں اور بین المسالک وفاق المدارس و مساجد کے ذریعے ملک میں ایک غیر سرمایہ دارانہ غیر جمہوری نظم اقتدار قائم کریں جو سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کی جوازیت کو بتدریج مفلوج کر دے۔

۷۔ ہمارے انتخابی عمل کا مقصد اسی غیر سرمایہ دارانہ غیر جمہوری نظم اقتدار کا دفاع اور اس کی توسیع ہو۔

نظام سرمایہ داری کو بدلنا ہے تو یہ سب کرنا ہو گا[۶]۔

اے ارکان جماعت تم نے بیسویں صدی میں پہلی مرتبہ ایک ایسی جماعت قائم کی جس کا وجۂ وجود غلبۂ دین یعنی قیام ریاست اسلامی تھا۔ اس وجۂ وجود کو فراموش نہ کرو۔ نہ اس کو غیر معینہ مدت تک موخر کرنے کے حیلے بہانے تلاش کرو۔ نہ سرمایہ دارانہ نظم اقتدار میں شمولیت کے خواب دیکھو۔ تم حسینی ہو۔

خدا نے تم غریبوں پر عجب احسان فرمایا
علم شبیر کا بے شک تمہارے ہاتھ میں آیا

اے ارکان جماعت خبردار امام عالی مقام کا یہ علم سرنگوں نہ ہونا چاہیے۔

## نوٹس اور حوالہ جات

۱۔ حضور ﷺ نے مکے میں "دارِ ندوہ" کے متوازی اپنا ایک سیاسی و سماجی نظم قائم کیا۔ یہ جدید سیاسی اصطلاح میں "Parallel Power Structure" کہلاتا ہے۔

● یہ محض دعوت نہیں تھی بلکہ ایک عملی چیلنج تھا جس نے قریش کے سیاسی اقتدار کو للکارا۔

● کفار کو "عبادت" سے اتنی تکلیف نہیں تھی جتنی اس "نظمِ اطاعت" سے تھی جو مکے کے اندر پیدا ہو رہا تھا۔

● سیرت کے مطالعے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکۂ مکرمہ میں کم از کم تین خفیہ تنظیمیں قائم فرمائیں تھیں۔ دو مکۂ مکرمہ میں تھیں (بالترتیب دار ارقم اور دار سعید بن زید) اور تیسری بیرون مکہ تنظیم ان افراد پر مشتمل تھی جنہیں آپ نے اپنے اپنے قبائل میں واپس بھیج دیا تھا اور فرمایا تھا کہ وہاں رہ کر وہ آپکے اگلے فرمان کا انتظار کریں۔

۲۔ "غیر اسلامی ریاست کا نظم اجتماعی اسلامی معاشرت کو کچلنے کے درپے رہتا ہے"، موجودہ دور کی تلخ حقیقت ہے۔

● سرمایہ دارانہ نظام اپنی تعلیم، میڈیا اور معیشت کے ذریعے فرد کے تزکیے کو ناممکن بنا دیتا ہے۔

● ریاست کے بغیر معاشرت کی مثال ایسے ہی ہے جیسے بغیر دیوار کے باغ، جسے ہر راہ چلتا جانور اجاڑ سکتا ہے۔

۳۔ محض "تنظیمی نظم وضبط" کو تقویٰ سمجھ لینا ایک فکری مغالطہ ہے۔

● روحانی غذا کا متبادل: جب تک کارکن کے پاس صوفیائے عظام کے تجربات اور "ذکر" کی حلاوت نہیں ہو گی، وہ سیاسی میدان کی "اقتدار پسندی" اور "شہرت" کے فتنوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

● علمی انحطاط: ملفوظاتِ اولیاء سے دوری نے کارکن کو ایک "سیاسی پرزہ" تو بنا دیا، لیکن وہ "صاحبِ دل" نہ بن سکا جو سیاست کو اللہ کی رضا کا ذریعہ سمجھتا ہو۔

برصغیر کی تحریکِ جہاد اور احیائے دین کی روایت میں سیاست اور تصوف الگ نہیں تھے۔

● ہمارے بزرگوں کی سیاست سراسر "للّٰہیت" پر مبنی تھی کیونکہ ان کی جڑیں خانقاہ میں تھیں۔

● جب جماعت نے اپنے آپ کو اس تاریخی تسلسل (Historical Continuity) سے کاٹ کر صرف مولانا مودودی کی جدید فکری تعبیر تک محدود کر لیا، تو جو علمی خلا پیدا ہوا اسے "پاپولرزم" (عوام زدگی) نے پُر کیا۔ پاپولرزم ہمیشہ وقتی جذباتی نعروں اور سطحی اخلاقیات پر پنپتا ہے، جس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ اقدار (مثلاً نمائش، مادہ پرستی) نفوذ کر گئیں۔

● سیاست "عبادت" تب بنتی ہے جب اس کے پیچھے ایک مضبوط ثقافتی اور روحانی بنیاد ہو۔

اگر سیاست صرف سیٹوں کے حصول کا نام ہے، تو وہ سرمایہ دارانہ ہے۔

اگر سیاست "کلمۃ اللہ" کی بلندی کے لیے ایک "روحانی جہاد" ہے، تو اس کے لیے کارکن کا مستجاب الدعوات اور ذاکر ہونا ضروری ہے۔

۴۔ کسی بھی انقلابی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس کی "Base" پر ہوتا ہے۔

● مخلصینِ دین (The Core): یہ وہ ڈھائی کروڑ افراد ہیں جو دین کے لیے درد رکھتے ہیں۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ ان سے کٹ کر نوے فیصد "غیر منظم عوام" (Masses) سے براہِ راست خطاب کرنا ایک ایسی زمین پر بیج بونے کے مترادف ہے جو بنجر ہے۔

● پاکستان میں مذہبی جڑیں مسلک سے جڑی ہیں۔ جماعت نے خود کو مسلک سے بالاتر کرنے کی کوشش میں ان روایتی اداروں سے دوری اختیار کر لی جو اصل میں "تحفظِ دین" کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔

● سرمایہ دارانہ عدل: جب جماعت "حق دو" یا محض "عوامی حقوق" کی بات کرتی ہے جو کہ خالصتاً مادی اور سرمایہ دارانہ فریم ورک کے اندر ہوتے ہیں، تو وہ اپنے اس انقلابی ایجنڈے سے دور ہو جاتی ہے جو "حاکمیتِ الٰہیہ" کا تقاضا کرتا ہے۔

۵۔ یہ شعر "چلو تو ساری جماعتوں کو ساتھ لے کے چلو" محض جذباتی نہیں بلکہ ایک سٹریٹجک اشارہ ہے۔

● اس کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کو ایک "Vanguard Party" (ہراول دستہ) بننا چاہیے جو تمام مسلکی اور روایتی قوتوں کو ایک بڑے انقلابی مقصد (ریاست کی تبدیلی) کے لیے متحد کر دے۔

● اگر جماعت ان مسلکی قوتوں سے الگ ہو کر خود ایک "سوشل ڈیموکریٹک" پارٹی بن جائے گی، تو وہ نہ تحفظِ دین کر سکے گی اور نہ غلبۂ دین۔

۶۔ مساجد و مدارس کا نیٹ ورک (Grassroots Institutional Power):
ہماری یہ تجویز ہے کہ مخلصینِ دین کی قیادت میں ایک غیر سرمایہ دارانہ نظم قائم کیا جائے۔ یہ دراصل ریاست کے متوازی ایک "سماجی و سیاسی ڈھانچہ" کھڑا کرنا ہے۔

یہ حکمتِ عملی "متوازی ریاست" کے قیام پر مبنی ہے، جہاں سرکاری اداروں کی جوازیت (Legitimacy) کو عوامی سطح پر مفلوج کر دیا جاتا ہے۔

جمہوری عمل میں شرکت کا مقصد اقتدار کا حصول نہیں، بلکہ اپنے "غیر جمہوری و غیر سرمایہ دارانہ نظم" کا تحفظ ہونا چاہیے۔ یہ ایک " Defensive and Expansionist Politics" ہے جو نظام کو اندر سے توڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

# مجلہ جسارت برائے اجتماع عام جماعت اسلامی نومبر ۲۰۲۶ء

جاوید اکبر انصاری

یہ ۲۰۹ صفحات پر مشتمل مجلہ واضح کرتا ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان پر ترکی اور تیونس کی سابقہ اسلامی جماعتوں کی طرح سرمایہ دارانہ ریاست قابض ہوتی جارہی ہے۔

اس دعوے کے ثبوت کے ضمن میں اس مجموعے میں شامل چند مضامین کا تجزیہ پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

شاہنواز فاروقی جو روزنامہ جسارت کے شاید واحد نظریاتی مفکر ہیں کا مضمون مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح سے لبریز ہے۔ وہ پاکستان کی دیگر تمام اسلامی جماعتوں پر فرقہ پرستی کا بہتان باندھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولانا مودودی نہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے نہ کسی مسلک سے۔ یعنی مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نہ حنفی تھے نہ چشتی اور آپ کے فتاویٰ کی کسی معتبر اور معروف اسلامی مکتب فکر سے کوئی سند نہیں ملتی۔ مولانا مودودی دوسرے علماء کی طرح محض ایک عالم دین نہیں بلکہ بیسویں صدی کے واحد تاریخ ساز اسلامی مفکر ہیں۔ مولانا مودودی کی فکر کا اثر دنیا کی ہر جاری اسلامی تحریک پر پڑا ہے۔ کیا یہ بات تحریک طالبان کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جو تھیوڈیمو کریسی کے تصور کو صریحاً رد کرتی ہے؟ کیا عرب اسلامی تحریکیں سید قطب رحمۃ اللہ علیہ کی فکر سے زیادہ وابستہ نہیں؟ بقول شاہنواز فاروقی مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے مخالفین بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ پاکستان میں جو اسلامی شور و غلغلہ ہے وہ سب صرف مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے ہے۔ یعنی دیگر تمام اسلامی جماعتوں اور گروہوں کا کام بالکل بے وقعت ہے اور حکومت جو تقریباً روزانہ خلاف شرع اقدامات کر رہی ہے وہ شاہنواز فاروقی کو نظر نہیں آتے اور ان کے خیال میں اب کوئی اسلام کے خلاف کام کرنے کا نہیں سوچ سکتا۔

شاہنواز فاروقی کے بقول جو اوصاف تحریک اسلامی کے نظریاتی کارکنوں کو لازماً اپنانے چاہیے وہ نیت کا اخلاص، راسخ ایمان اور تقویٰ ہیں۔ ان اوصاف کی افزائش اور فروغ کے لیے جو

ادب ملتا ہے وہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا نہیں دیگر اکابر علماء مثلاً حضرت خیر آبادی، قطب الاقطاب مہاجر مکی، فاضل بریلوی، حکیم الامت اشرف علی تھانوی اور حضرت انور شاہ کشمیری رحمہم اللہ علیہم اور ان کے سلسلے کے علماء کا ہے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ موضوع ہی نہیں۔ آپ کی رائے میں تزکیۂ نفس تحرک کے لازمی منطقی نتیجے کے طور پر خود بہ خود پیدا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ تصوف کے معروف اشغال کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی کتاب میں امام غزالی رضوان اللہ علیہ کے کام کی کمزوری ان کے رجوع الی التصوف کو قرار دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے کام کو برصغیر کے مرکزی اسلامی علمیاتی دھارے میں سمویا نہیں جائے گا برصغیر کے مخلصین دین کی اکثریت کے لیے ان کی فکر ہمیشہ اجنبی رہے گی۔ جب تک مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا کام اسلامی تحرک کے مرکزی دھارے سے دور رہے گا وہ جماعت کو سرمایہ دارانہ ریاستی نظام میں ضم کرنے کی راہ ہموار کرتا رہے گا۔

شاہنواز فاروقی لکھتے ہیں کہ ہم کو ایک عام انسان کی خدمت کرنے والی جماعت ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ ہم اس خدمت کو سیاسی نتیجے سے منسلک نہ کریں۔ یہ ایک نہایت خطرناک فکر ہے جو جماعت اپنی پیہم انتخابی ناکامیوں کے جواز کے طور پر پیش کرتی آئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نظاماتی تحرک اور تغیر کے ہدف کو ترک کر دیں اور خدمت خلق کے کام کو غلبۂ دین کا جزو نہ بنائیں۔ یہ جماعت کو سرمایہ دارانہ تغلب میں ضم کرنے کا موثر ترین ذریعہ ہے اور الخدمت فاؤنڈیشن کا کام، بنو قابل اور میرا برانڈ پاکستان کی تحریکیں جماعت کو اسی راہ پر گامزن کیے ہوئے ہیں۔ خدمت خلق دعوت اسلامی کے پھیلاؤ سے منسلک نہ ہو تو وہ لازماً سرمایہ دارانہ نظام کے اندر انضمام کا ذریعہ بنتی ہے۔

بائیں بازو کے معروف صحافی محمود شام جماعت کو سائنس اور مذہب کے امتزاج کو فروغ دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یعنی سرمایہ دارانہ عقلیت (یعنی ریشنلٹی) کو اپنی پالیسی سازی میں

مرکزی اہمیت دینے کا۔ وہ بنو قابل تحریک کی وکالت کرتے ہیں۔ وہ جماعت اسلامی کو یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ دہریہ قوم پرست پارٹیوں سے اشتراک عمل کے ذریعے ان دہریوں کو اپنی تنظیمی قوت سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرے۔

جسارت کے دیرینہ نامہ نگار سلمان عابد افغانستان پر بھارت سے گٹھ جوڑ کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ جماعت کی مقامی حکومتوں کی خدمات کو سراہتے ہیں کیونکہ یہ حکومتیں سرمایہ دارانہ تحکم کا ایک لازمی جزو ہیں اور سرمایہ دارانہ قانونی اور دستوری نظاماتی اصلاح کی تحریکات سے توقع وابستہ کرنے کا بھی ذریعہ ہیں۔ اس ضمن میں وہ دہریہ (یعنی سیکولر) سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی یعنی سرمایہ دارانہ سامراجی ووٹ بینک سے جماعت کو اشتراک عمل کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ جماعت کے کام کی سرمایہ دارانہ پروفیشنلائزیشن کی وکالت بھی کرتے ہیں۔ وہ جماعت کو یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خواتین کو پبلک لائف میں شامل کرنے کی مہم چلائے۔ ان کے خیال میں جماعت کو "انتہا پسندوں" کے خلاف موثر جدوجہد کرنی چاہیے۔

جماعت کے سرمایہ دارانہ نظام میں انضمام کی سب سے پرزور وکالت ڈاکٹر اسامہ رضی نائب امیر جماعت اسلامی نے پیش کی ہے۔ ان کے خیال میں نظریاتی جنگ اب ختم ہو چکی ہے اور یہ جنگ جماعت اسلامی جیت چکی ہے لہٰذا نظریاتی کام کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ ان کے خیال میں سید مودودی کے خیالات نے دنیا بھر میں سوچنے سمجھنے والوں اور مجموعی طور پر امت مسلمہ کو فتح کر لیا ہے۔ مغربی دنیا بھی مولانا مودودی کی فکر بڑی حد تک سمجھ چکی ہے۔ اور سید مودودی سے بڑا مفکر مسلم اور غیر مسلم دنیا میں کوئی نہیں۔

اسامہ رضی کی رائے میں آج کا مسئلہ نظریاتی نہیں خالصتاً عملی ہے اور اس عمل کو موثر بنانے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام سے اس نوعیت کی مصالحت کی ضرورت ہے جو تیونس کے رہنما راشد غنوشی اپنی جماعت کو ایک دہریہ سیاسی جماعت بنا کر اور تنفیذ شریعت کے مطالبے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دستبردار ہو کر کر رہے ہیں۔ وہ تحریک طالبان کو ناکام قرار دیتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ جب ملک میں معروضی انقلابی حالات پیدا ہو جائیں تو انقلابی جماعت کو ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کی رائے میں پاکستان میں یہ انقلابی حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک عرصہ تک عوام میں انقلابی شعور پست رہا لیکن اب پاکستان طبقاتی احساس کا حامل ہو گیا ہے۔ ان کی رائے میں اس طبقاتی کشمکش کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام جمہوری عوامی قوتیں، خواہ سیکولر ہوں یا اسلامی متحد ہو کر سڑکوں پر نکل آئیں۔ حکمران طبقے کی بساط الٹ دیں تاکہ پاکستان کے عوام کو حقیقی آزادی میسر آئے۔

اسامہ بن رضی کی رائے میں پاکستان میں ذہنی آزادی اور شعور کا انقلاب آ چکا ہے اور اب سیاسی انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ہے۔

فروغ آزادی کی یہ جدوجہد ویسی ہو گی جیسی کہ ۱۶۸۸ء کے برطانوی پارلیمانی انقلاب میں تھی، جس کی اسامہ بن رضی بہت تعریف کرتے ہیں (اور خلاف واقعہ) اس کو پرامن قرار دیتے ہیں۔

پاکستان میں جو انقلاب آئے گا وہ برطانوی انقلاب کی طرح خالصتاً سرمایہ دارانہ، طبقاتی، دستوری اور پرامن انقلاب ہو گا۔

برطانوی انقلاب کی طرح پاکستانی انقلاب کی کلیدی قدر عوامی آزادی کا فروغ ہو گا۔ اس کا مقصد عوام کے ہاتھوں میں اقتدار کو سونپنا ہو گا۔ حکمران عوام کے سامنے جواب دہ ہوں گے اور سرمایہ دارانہ عدلیہ تحکمِ قانون سرمایہ کو یقینی بنائے گی۔

موجودہ آئین اور قانون کی بالادستی عوام کو ہیومن رائٹس فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اسامہ بن رضی لکھتے ہیں کہ ہم نے آج تک ایسا معاشرہ نہیں دیکھا جہاں جمہوریت، آزادی، قانون کی بالادستی اور عوامی ہیومن رائٹس حاصل کئے جا چکے ہوں۔ ان کی رائے میں مکمل آزادی کی جدوجہد قانونی، آئینی اور جمہوری راستہ اختیار کرلے گی اور آئینِ پاکستان ہی نجات، آزادی، ترقی اور عوامی خوش حالی کا واحد راستہ ہے۔

یہ سرمایہ دارانہ انقلاب کی واضح ترین تصویر کشی ہے۔ اس میں سرمایہ دارانہ اہداف، مثلاً

آزادی، طبقاتی کشمکش، ترقی، ہیومن رائٹس اور عوامی حکمرانی کی وکالت کی گئی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ طریقۂ جدوجہد، پر امن جمہوری اور پارلیمانی جدوجہد، دونوں کی، بھرپور حمایت کرتے ہیں۔

اسامہ رضی کی توضیحات میں اسلامی انقلابی جدوجہد کا شائبہ تک موجود نہیں۔ نائب امیر کی رائے میں جماعت اسلامی کو سیکولر دہریہ قوتوں سے اشتراک عمل سے ایک خالص سرمایہ دارانہ انقلاب کی تیاری کرنی چاہیے۔ یہ جماعت کی مکمل سیکولرائزیشن کا پروگرام ہے۔

اسامہ بن رضی کی رائے میں اب دعوت کا مرحلہ گزر گیا ہے۔ وہ مغرب میں اسلام کے پھیلاؤ کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مسلم امت میں دعوتی عمل کے فروغ سے تو انہیں کچھ سروکار نہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ جماعت کی سیکولرائزیشن کی یہ مہم مولانا مودودی رحمہ اللہ کی مدح سرائی کی آڑ میں چلائی جارہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا مودودی رحمہ اللہ کے تین بنیادی اجتہادات، اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے (جو حضرت شاہ ولی اللہ سے ماخوذ ہے)، مغرب جاہلیت خالصہ ہے اور دور حاضر میں جدوجہد اقامت دین کے فرض کی ادائیگی میں ریاستی اقدام مقدم ہے، عہد ساز ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی فکر میں خاموشیاں نہیں۔ آپ کا پیدا کردہ ادب تطہیرِ نفوس کے ضمن میں بالکل خاموش ہے۔ آپ معاشرتی تغیراتی عمل کے نباض نہ تھے اور سرمایہ دارانہ ادارتی صف بندی کو غیر اقداری سمجھتے تھے۔ آپ نے مغرب کو جاہلیت خالصہ تو کہا لیکن مغربی تنویری منہج علمیت (سائنٹفک میتھاڈولوجی) کو رد نہ کیا بلکہ اس کی بنیاد پر قائم ہونے والی ٹیکنالوجی کو بھی غیر اقداری قرار دیا۔ آپ نے تغلبِ نظام اسلامی کی جو حکمت عملی وضع کی یعنی اسلامی جمہوریت اور تھیوڈیموکریسی کا فروغ وہ کہیں بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ نہ پاکستان میں نہ الجیریا میں نہ مصر میں نہ ترکی میں اور جہاں بھی اسلامی انقلاب آئے، مثلاً ایران میں، افغانستان میں، یمن میں، وہاں اس حکمت عملی سے کچھ سروکار نہیں رکھا گیا۔

مغرب، چین اور بھارت میں دعوت کے پھیلاؤ کی اشد ضرورت ہے اور یہ فریضہ صوفیائے عظام کی کئی جماعتیں بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ وہاں سرمایہ دارانہ نظام کے تبدل کے کی کوئی حکمت عملی اور شعور کسی کے پاس نہیں نہ عوام میں خواص میں۔ وہاں مولانا مودودی رحمہ اللہ کو مستشرقین کے ایک محدود گروہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ مغرب میں اشاعت دین مولانا مودودی رحمہ اللہ کا مقصد ہی نہیں تھا۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ کے تین کلیدی اجتہادات کی بنیاد پر اسلامی انقلابی جدوجہد مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم:

۱۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ کی فکر کو برصغیر کے مرکزی اسلامی دھارے میں سمو دیں۔ اس کے بغیر برصغیر کے مخلصین دین (جو ہمارا بنیادی حلقہ constituency ہیں) کے لیے مولانا مودودی رحمہ اللہ کی فکر ہمیشہ اجنبی رہے گی۔

۲۔ معاشرتی تغیراتی عمل کے گہرے مطالعے کے ذریعے اس معاشرے میں ایسی اسلامی ادارتی صف بندی کا اہتمام کریں جو ریاست درون ریاست قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔

۳۔ سرمایہ دارانہ فکر اور سرمایہ دارانہ علمیت کے تجزیے کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ نظاماتی تضادات کی نشان دہی کریں جن کو مہمیز دینا اسلامی انقلابیوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

یہ کام نہ ہو سکا تو مولانا مودودی رحمہ اللہ کی فکر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لایعنی irrelevant ہوتی چلی جائے گی۔ محض مولانا مودودی رحمہ اللہ کی مدح سرائی سے ان کی فکر کو زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔

# جماعت اسلامی پاکستان کے اجتماع عام ۲۱، ۲۲ اور ۲۳ نومبر ۲۰۲۵ مینار پاکستان لاہور کی تفصیلی روداد

منصور اقمر

جماعت اسلامی کا نصب العین عموماً اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ "حکومتِ الٰہیہ یا اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کے ذریعے رضائے الٰہی اور فلاحِ اخروی کا حصول"۔ سوال یہ ہے کہ ایک اسلامی جماعت، جس کا مقصد حکومتِ الٰہیہ یا اسلامی نظامِ زندگی کا قیام ہو، اگر عملاً اس نصب العین کو پسِ پشت ڈال دے اور اپنی جدوجہد کو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی محض اصلاح تک محدود کر دے، تو اس صورتِ حال کو کس نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے؟

اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو خود یہ نصب العین اس امر کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اس کی اصل روح کو ایک مختصر مگر جامع تعبیر میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگر اسے صرف "شریعتِ اسلامی کے نفاذ" کے الفاظ سے ادا کیا جائے تو شاید بات زیادہ واضح اور بامعنی ہو۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ "جماعت اسلامی کا نصب العین شریعتِ محمدی ﷺ کا ہر سطح پر نفاذ ہے" تو اس سے نہ صرف غیر ضروری لفاظی ختم ہو جاتی ہے بلکہ مقصدِ حیات بھی پوری صراحت کے ساتھ ہر سطح پر متعین ہو جاتا ہے۔ اس طرح ممکنہ ابہامات، خدشات اور سوالات کے دروازے بھی بڑی حد تک بند ہو جاتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی اصولاً ایک نظریاتی، اسلامی اور انقلابی جماعت ہے، کیونکہ اس کے نصب العین میں اس کا مقصد واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے: ایک ایسی ریاست کا قیام جس کا مطمحِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہو، اور جس کا مقصد تمام انسانیت کو دنیا و آخرت میں کامیابی سے ہمکنار کرنا ہو۔

جب ہم جماعت کو ایک "نظریاتی اسلامی انقلابی جماعت" قرار دیتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بنیاد کسی وقتی سیاسی مفاد یا گروہی عصبیت پر نہیں، بلکہ ایک ابدی اور عالمگیر

نظریے پر ہے۔ اس انقلابی فکر کے تین بنیادی ستون درج ذیل ہیں:

## ۱۔ ریاست کا خدائی تصور

جماعت کے نصب العین کے مطابق ریاست محض ایک انتظامی اکائی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کا مقصد کسی خاص طبقے کی خوشنودی نہیں بلکہ "رضائے الٰہی" کا حصول ہے۔ یہ تصور اسے ان تمام جدید سیکولر ریاستوں سے ممتاز کرتا ہے جہاں حاکمیتِ اعلیٰ عوام یا کسی مخصوص گروہ کے پاس ہوتی ہے۔

## ۲۔ انسانیت کی فلاح کا عالمگیر مشن

نصب العین میں "تمام انسانیت" کا لفظ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ جدوجہد صرف مسلمانوں تک محدود نہیں، بلکہ اسلام کے پیغام کو تمام انسانیت تک پہنچانا اور عادلانہ نظام کے ثمرات سے پوری نوعِ انسانی کو مستفید کرنا مقصود ہے۔ اس جدوجہد کا مقصود ابدی سعادت اور اخروی فلاح ہے۔

## ۳۔ نظریاتی انقلاب بمقابلہ سطحی تبدیلی

ایک انقلابی جماعت کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نظام کے اندر محض پیوند کاری (Patchwork) نہیں کرتی، بلکہ جڑوں سے تبدیلی لاتی ہے۔

ذہنی انقلاب: افراد کی سوچ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا۔

سماجی انقلاب: معاشرتی اقدار کی درستی۔

سیاسی انقلاب: اقتدار کی باگ ڈور صالح قیادت یعنی علماء کے سپرد کرنا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا، اگر نصب العین کی لفاظی کو سادہ کر کے "شریعتِ وطریقت محمدی ﷺ کا نفاذ" قرار دیا جائے، تو یہ ان تمام مقاصد کو ایک ہی جملے میں سمو دیتا ہے۔ شریعت کا نفاذ ہی دراصل وہ عملی صورت ہے جس کے ذریعے رضائے الٰہی اور انسانیت کی فلاح ممکن ہے۔

۲۱، ۲۲ اور ۲۳ نومبر ۲۰۲۵ء کو مینارِ پاکستان لاہور میں اجتماعِ عام منعقد کیا گیا۔ سالانہ اجتماع جماعتِ اسلامی کی دیرینہ روایات میں شامل رہا ہے، جو اصولی طور پر ارکانِ جماعت پر مشتمل ہونا چاہیے۔ تاہم ارکان، کارکنان اور متفقین پر مشتمل ایک اجتماع، جسے اجتماعِ عام کہا جاتا ہے، بھی وقتاً فوقتاً منعقد کیا جاتا رہا ہے۔

ماضی میں ان اجتماعات کے ساتھ اجتماعِ ارکان بھی منعقد ہوتا تھا، لیکن اس مرتبہ اجتماعِ ارکان نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ شوریٰ میں یہ طے پایا تھا کہ اجتماعِ ارکان منعقد نہ کیا جائے۔ تاہم اس فیصلے کی مزید وضاحت کہیں سننے میں نہیں آئی کہ آخر اجتماعِ ارکان کیوں نہیں کیا گیا[۱]۔

حالانکہ اجتماعِ ارکان جماعتِ اسلامی کے تمام کاموں کے جائزے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں[۲]۔ لیکن موجودہ امیر جماعتِ اسلامی حافظ نعیم الرحمٰن کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ اجتماعِ ارکان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے اور اپنی شوریٰ کے ذریعے—جو بظاہر ان کے کنٹرول میں معلوم ہوتی ہے—پورے نظم کو چلاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شوریٰ ان کی مٹھی میں بند محسوس ہوتی ہے، کیونکہ ان کے اقدامات کی کھلی مخالفت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اپنے اختیارات کو بھرپور انداز میں استعمال کرنا وہ بخوبی جانتے ہیں[۳]۔

اجتماع گاہ ایک بہت بڑے اسٹیج سے مزین تھی۔ یہ اسٹیج تقریباً تین کنٹینروں کو تہہ در تہہ رکھ کر بنایا گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ نہایت وسیع و عریض اور خاصا بلند نظر آتا تھا۔ ماضی میں اسٹیج پر عموماً قرآنِ کریم کی آیات کو بطور تھیم نمایاں کیا جاتا تھا، لیکن افسوس کہ اس اجتماع کی تھیم "بدل دو نظام" تھی، جو اسٹیج پر نصب تین سے چار بڑی دیوہیکل ٹی وی اسکرینوں پر نمایاں طور پر دکھائی جا رہی تھی۔

اسٹیج اور زمین کے درمیان بھی ایک بڑی دیوہیکل اسکرین لگائی گئی تھی، جس پر اسٹیج پر ہونے والی تمام کارروائی براہِ راست دکھائی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسٹیج اتنا اونچا تھا کہ قریب بیٹھے ہوئے افراد کے لیے بھی اسٹیج پر ہونے والی سرگرمیوں کو براہِ راست دیکھنا مشکل

تھا۔

اسٹیج بے انتہا روشنیوں سے آراستہ تھا، جو پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھیں اور مسلسل چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں۔ اس منظر کو دیکھ کر کسی طور یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ یہ ایک اسلامی اجتماع کا اسٹیج ہے؛ بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی تفریحی یا رقص کے پروگرام کے لیے اسٹیج تیار کیا گیا ہو۔ جب بھی موقع ملتا، "بدل دو نظام" کا ایک ترانہ — جو موسیقی سے مزین تھا — چلایا جاتا، اور اسی دوران روشنیوں کی کرنیں چاروں طرف اس انداز سے گھومتی تھیں کہ گویا نوجوانوں کے کسی ڈانسنگ پروگرام کا منظر ہو۔

ایک اندازے کے مطابق صرف اسٹیج کی تیاری پر تقریباً ۵۰ لاکھ روپے تک لاگت آئی ہوگی۔ اس کے علاوہ اجتماع گاہ میں مختلف مقامات پر بھی بڑی دیوہیکل اسکرینیں نصب کی گئی تھیں۔ اجتماع گاہ میں خواتین کے لیے علیحدہ حصہ مختص تھا، تاہم کیمروں کے ذریعے بڑی اسکرینوں پر خواتین کی اجتماع گاہ کے شرکاء بھی دکھائے جا رہے تھے، کیونکہ کیمرے اجتماع گاہ کے مختلف حصوں میں نصب تھے۔ یہ تمام جدید کیمرے تھے جو براہِ راست نشریات کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ڈرون کیمرے بھی مسلسل استعمال کیے جاتے رہے، جو فضائی ریکارڈنگ کر رہے تھے۔

شرکاء کے لیے اجتماع گاہ میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا تھا، جبکہ اسٹیج کے سامنے اگلی نشستوں پر بڑی تعداد میں صوفے بھی رکھے گئے تھے۔ نماز کے لیے کوئی باقاعدہ علیحدہ انتظام نظر نہیں آیا۔ اگرچہ کرسیوں کے درمیان متعدد صفیں مرد و خواتین شرکاء کی موجود تھیں، لیکن ایسا کوئی بڑا اہتمام نہیں تھا کہ تمام شرکاء ایک جگہ جمع ہو کر نماز ادا کریں۔ جب نماز کا وقت ہوتا تو شرکاء اگر چاہتے تو اسٹیج سے ادا کی جانے والی نماز میں شامل ہو جاتے، یا اپنی اپنی جماعتیں قائم کر لیتے۔

اجتماع گاہ کھلے آسمان کے نیچے قائم کی گئی تھی۔ موسم میں زیادہ سردی نہیں تھی، اس لیے تمام شرکاء آرام سے بیٹھ کر اجتماع میں شریک رہے۔ جب بھی کوئی اہم خطاب ہوتا تو شرکاء کی بڑی

تعداد اجتماع گاہ میں موجود ہوتی۔ سب سے زیادہ حاضری آخری دن امیر جماعت اسلامی حافظ نعیم الرحمٰن کے اختتامی خطاب کے موقع پر دیکھنے میں آئی۔ اسی طرح جب انٹرنیشنل سیشن جاری تھا تو اس وقت بھی شرکاء کی بڑی تعداد اسٹیج کے قریب جمع ہو گئی تھی اور نہایت توجہ کے ساتھ اسٹیج پر ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔

موبائل فون نے جس طرح پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، اسی کا عکس اجتماعِ عام میں بھی نظر آیا۔ خواتین، خصوصاً نوجوان خواتین، مسلسل سیلفیاں اور تصاویر بناتی دکھائی دیں۔ اسی طرح چند منچلی نوجوان لڑکیاں موٹر سائیکلوں پر ریلی کی صورت میں، جینز اور ہیلمٹ پہنے ہوئے، اجتماع میں شریک ہوئیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس منظر کو جماعتِ اسلامی کے سرکاری فیس بک پیج پر بھی سراہا گیا، جو ایک باعثِ شرم امر محسوس ہوتا ہے۔

اجتماع کا آغاز ۲۱ نومبر ۲۰۲۵ء کو نمازِ جمعہ سے ہوا۔ نمازِ جمعہ بادشاہی مسجد اور اجتماع گاہ— دونوں مقامات پر الگ الگ ادا کی گئی۔ اجتماع گاہ میں ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی (رئیس الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین) اور ڈاکٹر عطا الرحمن (نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان) نے جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز ادا کروائی۔

جبکہ بادشاہی مسجد میں بھی نمازِ جمعہ ادا کی گئی، جہاں دراصل کراچی، اسلام آباد اور پنجاب کے بعض علاقوں سے آنے والے شرکاء کے رہائشی کیمپ قائم تھے۔ نماز کے بعد کھانے کا وقفہ رکھا گیا، تاہم اس میں بھی کچھ تاخیر ہوئی۔ عمومی طور پر بہت سے شرکاء نے نماز مسجد ہی میں ادا کی اور اس کے بعد اجتماع گاہ کی طرف آئے۔ لیکن کھانا دیر سے ملنے کی وجہ سے متعدد شرکاء اجتماع گاہ میں نسبتاً دیر سے پہنچے۔

اجتماعِ عام کی باقاعدہ کارروائی نمازِ عصر کے بعد تلاوتِ قرآن مجید اور نعتِ رسول مقبول ﷺ کے ساتھ شروع کی گئی۔ تاہم جماعتِ اسلامی کے گذشتہ اجتماعات میں ہم نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ تلاوتِ قرآن اور نعت کے ساتھ ساتھ پاکستانی ترانہ بھی پڑھا جائے۔ اس

اجتماعِ عام کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی ابتدا میں پاکستان کا ترانہ بھی پڑھا گیا، جس میں تمام شرکاء کھڑے ہو کر ترانے میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد ناظمِ اجتماعِ عام، محترم لیاقت بلوچ نے تمام شرکاء کو خوش آمدید کہا اور ایک مختصر خطاب کیا۔ انہوں نے جماعتِ اسلامی کے پیغام کی مقبولیت اجاگر کی اور کارکنان کی محنت و قربانی کو سراہا۔

اس کے بعد امیر جماعتِ اسلامی پاکستان، حافظ نعیم الرحمان نے اپنا افتتاحی خطاب کیا۔ خطاب کی ابتدا انہوں نے سورہ ابراہیم کی آیات ۲۴ اور ۲۵ سے کی:

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِى السَّمَآءِ (۲۴) تُؤۡتِىۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍ بِاِذۡنِ رَبِّهَا وَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ (۲۵)

انہوں نے اس آیت کا ترجمہ ایک صفحے سے دیکھ کر پڑھا: "کیا تم نے نہ دیکھا کہ اللہ نے کلمہِ پاک کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے، جیسے ایک پاکیزہ درخت ہو جس کی جڑ قائم ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوں۔ ہر وقت اپنے رب کے حکم سے پھل دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ سمجھیں۔"

امیر جماعت اسلامی پاکستان حافظ نعیم الرحمان کے خطاب کے اہم نکات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱. اجتماع عام کا نعرہ "بدل دو نظام" ہے؛ مقصد ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں حاکمیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہو۔

۲. پاکستان کے دستور کو قرآن و سنت کے مطابق ہونا چاہیے؛ کسی بھی قانون سازی میں قرآن و سنت کے منافی اقدامات قبول نہیں ہوں گے۔

۳. ملک میں ۷۸ سال سے حکمرانوں نے قوم کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں دیا، جماعت اسلامی نوجوانوں اور عوام کو تنہا نہیں چھوڑے گی۔

۴. ۲۷ ویں ترمیم والے سن لیں، کسی وڈیرے، جاگیر دار، آرمی چیف یا صدر کو اللہ کے

نزدیک استثنا حاصل نہیں۔

۵. فلسطین اور کشمیر کے مسائل پر پاکستان کے حکمرانوں کو واضح موقف اختیار کرنا چاہیے؛ کسی سودے بازی یا ثالثی کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

۶. لاہور میں مینارِ پاکستان اور بادشاہی مسجد میں اجتماع عام میں لاکھوں افراد کی شرکت؛ ہزاروں کارکنان نے دن رات محنت کر کے انتظامات مکمل کیے۔

۷. خواتین کے لیے علیحدہ پنڈال ڈاکٹر حمیرا طارق کی قیادت میں تیار کیا گیا۔

۸. مولانا مودودی کی فکر کے مطابق جماعت اسلامی دین کے اصول کی بنیاد پر تنظیم، تربیت اور عوامی حمایت کے ذریعے آگے بڑھ رہی ہے؛ سیاست ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نظام کے قیام کے لیے ہے۔

۹. جماعت اسلامی مسلکی یا فرقہ وارانہ تقسیم کو نہیں مانتی، بلکہ امت کو جوڑنے کا کام کرتی ہے؛ مکمل نظام صرف اسلام میں ہے جو ہر مذہب کے لوگوں کو برابر حق دیتا ہے۔

۱۰. بیوروکریسی اور چند طاقتور افراد قوم پر حکمرانی کر رہے ہیں؛ بیس فیصد لوگ اسی فیصد عوام پر اجارہ داری قائم رکھتے ہیں۔

۱۱. جماعت اسلامی کشمیر، فلسطین، غزہ اور بلوچستان کے عوام کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتی ہے؛ اندرون سندھ، پنجاب اور دیگر علاقوں میں کسانوں اور غریب عوام کے استحصال کی نشاندہی کی۔

۱۲. جماعت اسلامی برسرِ زمین جدوجہد کرے گی؛ اقتدار فارم ۴۷ یا کسی کی آشیر باد سے نہیں بلکہ عوامی حمایت سے حاصل ہو گا۔

۱۳. مقصد: اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام قائم کرنا، اجتماعی انصاف، قوم پرستی نہیں بلکہ اصولوں پر مبنی قیادت۔

اجتماع کے پہلے دن نمازِ مغرب کے بعد، سلیم منصور خالد نے "سید مودودی: فکر، تحریک و انقلاب" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالے کا لب لباب یہ تھا کہ مولانا مودودی ایک

پر امن انقلاب کے قائل تھے جو اپنی تحریروں کے ذریعہ عوام الناس کی ذہن سازی کر کے ایک پائیدار انقلاب لانا چاہتے تھے۔

یہ پورا مقالہ مولانا مودودی رحمہ اللہ کی مدحت وستائش پر مبنی تھا، لیکن مقالے میں مولانا کے تینوں اصل مندرجہ ذیل انقلابی اجتہادات کا ذکر نہیں کیا گیا:

۱. مغرب جاہلیت خالصہ ہے۔

۲. اسلام مکمل دین ہے۔

۳. اسلامی ریاست اور اقامت دین کے بغیر انقلاب ممکن نہیں۔

اس کے بعد جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی پاکستان، امیر العظیم نے بھی مولانا مودودی کی مدحت اور تعریفیں پیش کیں، لیکن ان کا خطاب غیر مربوط اور جذباتی تھا، جس میں کارکنان کے لیے کوئی فکری اور عملی لمحہ فراہم نہیں کیا گیا۔

اجتماع عام کے پہلے دن کا تیسرا سیشن "بدل دو نظام" کے عنوان سے منعقد ہوا، جو اہمیت کا حامل رہا، تاہم افسوس کے ساتھ یہ دیکھا گیا کہ اس سیشن کی گفتگوئیں اسلامی نظام کے قیام یا اسلامی انقلابی جدوجہد سے بالکل تعلق نہیں رکھتی تھیں۔

اس سیشن میں مقررین اور موضوعات درج ذیل تھے:

۱. نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان، ڈاکٹر اسامہ رضی—سیاست

۲. نامور سینئر وکیل، اکرم شیخ—عدلیہ

۳. معروف معاشی ماہر اور سابق گورنر اسٹیٹ بینک، عشرت حسین—معیشت

۴. وائس چانسلر شفاء تعمیر ملت یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر اقبال خان—صحت

۵. صدر تنظیم اساتذہ پاکستان، الطاف حسین لنگڑیال—پاکستان کے تعلیمی مسائل اور ان کے حل۔

ڈاکٹر عشرت حسین نے سرمایہ دارانہ طریقہ کار بیان کرتے ہوئے بتایا کہ پاکستان کی ترقی میں عوام کی ایمانداری اور بچتیں بنکوں میں جمع کروانا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انہوں نے کارکنان

جماعت اسلامی کو تلقین کی کہ وہ ایمانداری سے اپنا ٹیکس ادا کریں، کیونکہ کسی بھی ملک کی ترقی کا راز عوام کی ریاستی احکامات پر پابندی اور ایمانداری ہے۔ دیگر مقررین نے بھی اسی تناظر میں اپنی تجاویز پیش کیں۔

سب سے زیادہ افسوس ناک تقریر نائب امیر ڈاکٹر اسامہ رضی کی تھی، جو جذبات سے بھرپور اور چیخ چیخ کر دہراتے رہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ عوام کی رائے کا احترام نہ ہونا اور ان کو حکمرانی کا حق نہ دینا ہے۔ تاہم یہ تقریر اسلام، ایمان، جہاد یا اسلامی انقلابی گفتگو سے یکسر خالی تھی۔

پہلے دن کا اختتام انور مسعود صاحب کی سربراہی میں ایک مشاعرے کے انعقاد کے ساتھ ہوا، جو رات گئے تک جاری رہا۔ مشاعرے کا موضوع "بدل دو نظام" تھا، تاہم شعرائے کرام نے اپنی مرضی کے مطابق شعر پڑھے۔ شرکاء کی تعداد بہت کم تھی، لیکن جو لوگ موجود تھے، وہ مشاعرے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

دوسرے دن کا آغاز نماز فجر اور درسِ حدیث سے ہوا، جس کے بعد ناشتے کا وقفہ دیا گیا۔

اجتماع عام کے دوسرے روز امیر جماعت اسلامی پاکستان حافظ نعیم الرحمن کے خطاب کے اہم نکات—خلاصہ

## ۱۔ نظریہ اور قیادت

- خاندان، وصیت اور وراثت پر چلنے والی پارٹیاں انقلاب نہیں لا سکتیں؛ جماعت اسلامی نظریاتی اور جمہوری جماعت ہے۔
- حکمران جمہوریت کے بنیادی اصولوں سے خوف زدہ ہیں، نوجوانوں کی شرکت کو محدود کرتے ہیں، اور اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات نہیں کرواتے۔

## ۲۔ بلدیاتی نظام اور اختیارات

- مسلم لیگ ن کے ظالمانہ بلدیاتی ایکٹ کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

- آئین کے آرٹیکل ۱۴۰-A کے تحت تمام اختیارات نچلی سطح (گراس روٹ لیول) پر منتقل کیے جائیں گے۔
- نچلی سطح پر اختیارات منتقل ہونے سے اجارہ داری اور وڈیروں کا نظام ختم ہو گا۔

## ۳۔ معاشرتی انصاف اور تعلیم

- سندھ میں ہاریوں، محنت کش خواتین اور بچوں کے حقوق کے تحفظ کی ضرورت۔
- ملک بھر میں یکساں نظام تعلیم فراہم کیا جائے گا؛ ۲ کروڑ ۶۲ لاکھ بچے تعلیم سے محروم ہیں۔
- نوجوانوں کے تعلیمی اور آئی ٹی کے شعبے میں پوٹینشل کو بروئے کار لانے کی ضرورت۔

## ۴۔ اقتصادی اور سرمایہ دارانہ نظام

- جاگیر دار، وڈیرے اور کارپوریٹ سسٹم عوام کے استحصال کا سبب ہیں۔
- سرمایہ دارانہ ذہنیت کے تحت غریبوں کو مزید غریب بنایا جارہا ہے۔
- کسانوں کو ان کی محنت کا حصہ دلوانا جماعت اسلامی کا مقصد ہے۔

## ۵۔ سیاسی موقف اور قومی یکجہتی

- پاکستان کی ریاست اور حکمران طبقہ انگریزوں کے بنائے ہوئے نظام کے تحت عوام پر حکمرانی کر رہے ہیں۔
- تمام شہری، چاہے وہ پی ٹی آئی کے کارکن ہوں یا مسلم لیگ ن کے، بدل دو نظام تحریک میں شامل ہوں۔
- قوم پرستی اور فرقہ واریت کے بغیر عوام کو یکساں حقوق فراہم کیے جائیں گے۔

## ۶۔ بین الاقوامی اور اسلامی موقف

- حکومتیں امریکا اور اس کے حواریوں کے آگے سر جھکاتی ہیں، جبکہ جماعت اسلامی اللہ کی حاکمیت اور نظام کو نافذ کرنے کے لیے جدوجہد کرے گی۔
- ربوبیت اور حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے؛ کسی انسان کو زمین پر خدا نہیں بنایا جاسکتا۔

## ۷۔ کارکنان اور عوام کی ذمہ داریاں

- کارکنان گلی محلوں میں جاکر پیغام پہنچائیں، عوام کو حقائق سے آگاہ کریں۔
- ظلم کے نظام کو کسی صورت قبول نہیں کیا جائے گا۔
- نوجوانوں اور عوام کی تعلیم، معیشت اور صحت کے مسائل پر توجہ مرکوز کی جائے۔

## ۸۔ نظام تعلیم اور ترقی

- ۵۰ ارب روپے تعلیمی بجٹ پر خرچ کرکے بچوں کو مفت و معیاری تعلیم فراہم کی جائے۔
- نوجوانوں کو آئی ٹی اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھانے کے لیے پروگرامز جیسے بنو قابل پروگرام کے تحت ۱۲ لاکھ نوجوان رجسٹرڈ ہو چکے ہیں۔

اجتماع عام کے دوسرے دن خواتین کا ایک خصوصی سیشن منعقد ہوا جس میں پورا اسٹیج خواتین کے حوالے کر دیا گیا۔ اجتماع گاہ کے سامنے کا بڑا حصہ بھی خواتین کے لیے مخصوص تھا اور چند انتظامی افراد کے علاوہ اسٹیج پر تمام ذمہ دار خواتین موجود تھیں۔

حلقہ خواتین جماعت اسلامی پاکستان کی سیکرٹری جنرل ڈاکٹر حمیرا طارق نے اپنے خطاب میں کہا کہ عورت کو محض نعروں کی نہیں بلکہ حقیقی حقوق کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ خواتین اب بیدار ہو چکی ہیں اور جماعت اسلامی عورت کو گھر کی زینت اور معاشرے کی قوت بنانا چاہتی ہے۔ ان کے مطابق اسلام نے عورت کو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے عزت و وقار دیا ہے، لیکن آج وہی عورت گھریلو تشدد اور وراثت سے محرومی جیسے مسائل کا شکار ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جماعت اسلامی جیلوں میں قید خواتین کی بحالی اور باعزت آزادی

کے لیے بھی جدوجہد کر رہی ہے۔

ناظمہ اجتماع اور ڈپٹی سیکرٹری ثمینہ سعید نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قرآن نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی مکمل وضاحت کر دی ہے۔ انہوں نے حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ کی علمی خدمات اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے اکابر کی تربیت کرنے والی خواتین کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان خواتین کو بھی اسی کردار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی نے پرجوش انداز میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اجتماع میں خواتین کی بھرپور شرکت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نظام کی تبدیلی کے لیے سنجیدہ اور پُرعزم ہیں۔

ڈپٹی سیکرٹری ڈاکٹر زبیدہ جبین نے کانفرنس کا اعلامیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ عورت پر ہونے والے مظالم کی بڑی وجہ قرآن کے نظام کا عدم نفاذ ہے۔ اعلامیہ میں سفارش کی گئی کہ نظام کی تبدیلی کے ساتھ صحت مند نسل کی تربیت کے لیے تعلیمی اداروں کو بچوں کی اخلاقی، نفسیاتی اور جسمانی نشوونما کی ذمہ داری بھی ادا کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ ماں اور بچے کے لیے صحت مند ماحول، سوشل میڈیا کے مثبت استعمال کی تربیت اور مفت صحت کی سہولتوں کے قیام پر بھی زور دیا گیا۔

اس سیشن کے دوران نمایاں کارکردگی دکھانے والی خواتین کو ہائی اچیورز ایوارڈز بھی دیے گئے۔

اجتماع عام کے دوسرے روز ایک اہم یوتھ سیشن بعنوان ''اٹھو جہاں بدل دو'' بھی منعقد ہوا۔ اس سیشن سے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظمِ اعلیٰ حسن بلال ہاشمی نے خطاب کیا۔ انہوں نے جماعت اسلامی کو مینارِ پاکستان پر تاریخی اجتماع کے انعقاد پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس اجتماع نے پاکستان کے نوجوانوں کو امید اور روشن مستقبل کا پیغام دیا ہے۔

انہوں نے کہا کہ پاکستان اس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی اصولوں پر مبنی نظامِ حیات قائم ہو اور ایسا معاشرہ تشکیل پائے جہاں عدل و انصاف، انسانی حقوق کا تحفظ اور ترقی کے مساوی مواقع میسر ہوں۔ تاہم گزشتہ کئی دہائیوں میں یہ خواب مکمل طور پر شرمندۂ

تعبیر نہیں ہو سکا اور نوجوان آج بھی انصاف اور مواقع کی کمی کا سامنا کر رہے ہیں۔

انہوں نے ملک کے تعلیمی بحران پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں تعلیم پر صرف جی ڈی پی کا ۱٫۷ فیصد خرچ کیا جاتا ہے۔ دنیا کے ۱۹۲ ممالک میں پاکستان تعلیم کے معیار کے لحاظ سے ۱۵۲ ویں نمبر پر ہے جبکہ ۲ کروڑ ۶۲ لاکھ بچے تعلیم سے محروم ہیں۔ جامعات میں بنیادی سہولیات، ہاسٹل اور ٹرانسپورٹ کی کمی، مالی و انتظامی مسائل اور طلبہ یونینز پر پابندی نوجوانوں کی صلاحیتوں کو محدود کر رہی ہے۔

انہوں نے کہا کہ گزشتہ برس ۱۴ ہزار اسکولوں کی نجکاری کا اعلان کیا گیا جبکہ تعلیمی اداروں کی فیسوں میں ۶۰۰ فیصد اضافہ ہو چکا ہے، جس کے نتیجے میں تعلیم اشرافیہ تک محدود ہوتی جا رہی ہے اور نوجوان بیرون ملک ہجرت پر مجبور ہو رہے ہیں۔

ناظمِ اعلیٰ نے طلبہ یونینز کی بحالی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۸۴ء میں طلبہ یونینز پر پابندی لگا کر جمہوریت کی نرسری کو بند کر دیا گیا تھا۔ بعد میں آنے والی جمہوری حکومتیں بھی اس پابندی کو ختم نہ کر سکیں۔

اپنے خطاب کے اختتام پر انہوں نے نوجوانوں کو امید اور عزم کا پیغام دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے نوجوان مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے اپنے کردار کو سنواریں، اسلام سے اپنا تعلق مضبوط کریں اور ملک کی تعمیر و ترقی میں فعال کردار ادا کریں۔

اس موقع پر معتمدِ عام اسلامی جمعیت طلبہ صاحبزادہ وسیم حیدر، مختلف صوبوں کے ناظمین اور مرکزی مجلس شوریٰ کے اراکین بھی موجود تھے۔

اجتماع عام کے دوسرے روز ایک خصوصی خواتین کانفرنس بعنوان ”جہاں آباد تم سے ہے“ منعقد کی گئی۔ اس موقع پر وہ ترانہ بھی چلایا گیا جو ماضی میں بے نظیر بھٹو کے وزیر اعظم بننے کے مواقع پر استعمال کیا جاتا تھا:

”یہ مائیں، یہ بہنیں، یہ بیٹیاں — قوموں کی عزت تم سے ہے“۔

اس سیشن میں پورا اسٹیج خواتین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور جماعت اسلامی حلقۂ خواتین

کی تمام ذمہ داران اسٹیج پر موجود تھیں۔ اجتماع گاہ میں خواتین کی بڑی تعداد شریک تھی اور پورے پروگرام کی مسلسل ریکارڈنگ بھی کی جاتی رہی۔

اس موقع پر یہ بھی مشاہدہ کیا گیا کہ شریک ہونے والی بعض خواتین نے چہرے پر نقاب نہیں کیا ہوا تھا۔

جماعت اسلامی حلقہ خواتین کی سیکرٹری جنرل ڈاکٹر حمیرا طارق نے اجتماع عام میں یوتھ سیشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نوجوان بچیاں قوم کا روشن مستقبل اور حقیقی تبدیلی کی امید ہیں۔ ان کے مطابق آج کی باصلاحیت بیٹیاں وہ صلاحیت رکھتی ہیں جو معاشرے کے بوسیدہ نظام کو بدل کر اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کے قیام میں کردار ادا کر سکتی ہیں۔

انہوں نے کہا کہ پاکستان کی نوجوان نسل، خصوصاً طالبات، علم، اخلاق اور قیادت کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ اگر انہیں مناسب مواقع، رہنمائی اور اعتماد فراہم کیا جائے تو وہ معاشرے کے مختلف شعبوں میں نمایاں کردار ادا کر سکتی ہیں۔

ڈاکٹر حمیرا طارق نے اس بات پر زور دیا کہ نظام کی حقیقی اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب نوجوان ذمہ داری، شعور اور مثبت کردار کے ساتھ آگے بڑھیں۔ انہوں نے بتایا کہ جماعت اسلامی طالبات اور بچیوں کی تربیت کے لیے مختلف تربیتی پروگراموں اور بنو قابل آئی ٹی کورسز کے ذریعے عملی رہنمائی فراہم کر رہی ہے۔

خواتین کے سیشن سے خطاب کرتے ہوئے امیر جماعت اسلامی پاکستان حافظ نعیم الرحمن نے ذمہ دارانِ حلقہ خواتین کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مینار پاکستان پر ہونے والا یہ اجتماع پاکستان کی تاریخ کا خواتین کا سب سے بڑا پاور شو ہے۔ ان کے مطابق یہ اجتماع اسلامی تحریک کی اس قوت کا اظہار ہے جو پاکستان کے نصف حصے یعنی خواتین کو بااختیار بنانا چاہتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ اسلام نے مرد کو قوام بنایا ہے، یعنی اسے خاندان کا ذمہ دار اور کفیل بنایا ہے، مالک نہیں۔ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ گھر کی معاشی کفالت اور بیوی بچوں کی ذمہ داری ادا کرے۔ تاہم موجودہ معاشی نظام، مہنگائی اور بے روزگاری کی وجہ سے خواتین کو بھی معاش

کے لیے گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ اگر ایک عادلانہ اسلامی نظام قائم ہو تو خواتین کو معاشی مجبوری کے تحت باہر نکلنے کی ضرورت نہ پڑے، البتہ وہ معاشرے کی بہتری کے لیے صحت، تعلیم، آئی ٹی، سائنس و ٹیکنالوجی، نفسیات اور دینی علوم کے شعبوں میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔

انہوں نے کہا کہ موجودہ عدالتی اور سماجی نظام کمزور ہے جہاں خواتین کو انصاف حاصل کرنا مشکل ہے۔ بہت سی جگہوں پر خواتین کو ملازمت کے دوران استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انہیں ان کے بنیادی حقوق بھی نہیں ملتے۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہمارے معاشرے میں خواتین کو اکثر وراثت کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات بظاہر دیندار طبقات بھی روایات کے نام پر ان کے حقوق سلب کر لیتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی خواتین کو ان کے جائز حقوق دلانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور خصوصاً وراثت کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے کی کوشش کرے گی۔

حافظ نعیم الرحمن نے اعلان کیا کہ جماعت اسلامی خواتین کے لیے فری آئی ٹی اسکالرشپ پروگرام شروع کر رہی ہے تاکہ وہ گھر بیٹھ کر یا باوقار انداز میں مختلف شعبوں میں کام کر سکیں۔ انہوں نے بتایا کہ بنو قابل پروگرام میں تقریباً ۱۲ لاکھ رجسٹریشنز ہو چکی ہیں جن میں بڑی تعداد بچیوں کی ہے، اور کئی طالبات اس پروگرام سے فائدہ اٹھا کر عملی زندگی میں کام شروع کر چکی ہیں۔

انہوں نے فلسطین کی ماؤں اور بہنوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے صبر اور استقامت کی مثال قائم کی ہے۔ ان کے مطابق اسلامی معاشرہ روحانی اور خاندانی اقدار کی بنیاد پر دنیا کے سامنے ایک بہتر نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

خطاب کے اختتام پر انہوں نے خواتین اور نوجوان بچیوں کو نصیحت کی کہ وہ تعلیم حاصل کریں، اپنے شعور میں اضافہ کریں، سوشل میڈیا کو مثبت انداز میں استعمال کریں اور حق و سچ کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کریں۔ انہوں نے کہا کہ خواتین اپنی صلاحیتوں کو معاشرے، خاندان اور امت کی بہتری کے لیے استعمال کریں اور آئندہ آنے والے دنوں میں ایک بڑی

جدوجہد کے لیے تیار رہیں۔

اجتماع عام میں ایک انٹرنیشنل سیشن بھی منعقد کیا گیا جس کی صدارت سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان سراج الحق کے ذمہ تھی۔ تاہم اس سیشن میں انہیں باقاعدہ خطاب کا موقع نہ مل سکا اور اختتامی دعا کے بعد انہیں صرف ایک منٹ گفتگو کے لیے دیا گیا۔

جب سراج الحق صاحب ڈائس پر آئے تو کارکنان کی جانب سے مسلسل نعرے لگائے جارہے تھے۔ اس پر انہوں نے کارکنان کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے برہمی کے ساتھ کہا کہ "مجھے ویسے ہی صرف ایک منٹ تقریر کے لیے دیا گیا ہے اور آپ لوگ نعروں کے ذریعے وہ بھی ضائع کرنا چاہتے ہیں۔"

اجتماع عام کے دوسرے روز آخری اور اہم سیشن "جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا" کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں ۴۵ ممالک سے آئے ہوئے تقریباً ۱۲۰ مندوبین نے شرکت کی۔ اس سیشن میں دنیا بھر کی مختلف اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کے رہنماؤں نے شرکت کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سیشن کی صدارت سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان سراج الحق نے کی۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ دنیا بھر سے جمع ہونے والے یہ رہنما دراصل ایک ایسی نئی دنیا کی تلاش میں یہاں اکٹھے ہوئے ہیں جہاں نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہو۔ انہوں نے کہا کہ ایسی دنیا کا قیام مطلوب ہے جہاں کشمیر اور فلسطین کو آزادی حاصل ہو، ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو رہائی ملے، اور عام آدمی کو انصاف میسر آئے۔

انہوں نے مزید کہا کہ اسلامی تحریکیں ایک ایسے نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں جس میں حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو اور معاشرہ عدل و انصاف پر قائم ہو۔ ان کے مطابق ایسا نظام ہونا چاہیے جس میں طبقاتی تفریق نہ ہو اور غریبوں کو مفت تعلیم اور علاج جیسی بنیادی سہولتیں حاصل ہوں۔

سراج الحق نے کہا کہ ایران اور افغانستان کے عوام نے قربانیاں دے کر استبدادی نظاموں کا

خاتمہ کیا، اور پاکستان میں بھی ایک دن ایسا آئے گا جب جاگیرداروں، وڈیروں اور طاقتور طبقات کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔

اس سیشن سے مختلف ممالک کے رہنماؤں نے خطاب کیا جن میں فلسطین، ترکی، ملائیشیا، مراکش، عراق، جنوبی افریقہ، بوسنیا، بنگلہ دیش، فلپائن، تیونس اور برطانیہ سمیت کئی ممالک کے نمائندگان شامل تھے۔ فلسطین، کشمیر اور دیگر مسلم خطوں کے مسائل، امت مسلمہ کے اتحاد اور عالمی سطح پر اسلامی تحریکوں کے کردار پر بھی گفتگو کی گئی۔

اس موقع پر صدر الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین شیخ علی محی الدین قرہ داغی نے امیر جماعت اسلامی حافظ نعیم الرحمن کو یادگاری شیلڈ پیش کی جبکہ ڈاکٹر آصف لقمان قاضی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

اجتماع عام کے تیسرے روز ''ملکی منظرنامہ اور حل'' کے عنوان سے ایک خصوصی سیشن منعقد ہوا جس سے جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر لیاقت بلوچ نے خطاب کیا۔

اپنے خطاب میں انہوں نے کہا کہ قوم اب جماعت اسلامی کے ساتھ کھڑی ہو چکی ہے اور منزل دور نہیں رہی۔ ان کے مطابق جماعت اسلامی اب صرف جدوجہد تک محدود نہیں بلکہ ملک کو حقیقی منزل تک پہنچانے کے لیے پرعزم ہے۔

انہوں نے کہا کہ پاکستان کے عوام کو دہائیوں سے جھوٹے وعدوں اور کھوکھلے نعروں کے ذریعے دھوکا دیا جاتا رہا ہے، جس کے نتیجے میں عوام کی امیدوں کا بار بار استحصال ہوا۔ تاہم اب قوم مزید فریب برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

لیاقت بلوچ کے مطابق جماعت اسلامی حافظ نعیم الرحمن کی قیادت میں ملک میں ایک حقیقی اسلامی انقلاب کا راستہ ہموار کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ دیانت دار، باصلاحیت اور شفاف قیادت ہی پاکستان کو معاشی، سماجی اور سیاسی بحرانوں سے نکال سکتی ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ جماعت اسلامی لسانی، صوبائی اور علاقائی تعصبات سے بالاتر ہو کر ''بدل دو نظام'' کی تحریک کو آگے بڑھا رہی ہے۔ ان کے مطابق پاکستان کو کرپشن، بدامنی، مہنگائی،

بے روزگاری اور سیاسی عدم استحکام سے نکالنے کا واحد راستہ قرآن و سنت کے عادلانہ نظام کا نفاذ ہے۔

انہوں نے کہا کہ مینارِ پاکستان کے سائے تلے لاکھوں افراد کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم بیدار ہو چکی ہے اور اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کے لیے متحد ہو رہی ہے۔ ان کے بقول یہ اجتماع محض ایک اجتماع نہیں بلکہ ایک نئی قومی جدوجہد کی ابتدا ہے۔

خطاب کے اختتام پر انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی اقتدار کے حصول کے لیے نہیں بلکہ خدمت، شفافیت اور عدل پر مبنی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔

صوبائی قائدین کے خطابات — اہم نکات

## کاشف سعید شیخ (امیر جماعت اسلامی سندھ)

- سندھ وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود غربت اور بنیادی سہولیات کی کمی کا شکار ہے۔
- پانی کی قلت اور ڈیلٹا میں پانی نہ چھوڑنے سے ساحلی اضلاع ٹھٹھہ اور سجاول کے مستقبل کو خطرہ ہے۔
- سندھ سمیت ملک بھر میں کرپشن، مہنگائی اور بے روزگاری نے عوام کو مشکلات میں ڈال دیا ہے۔
- شفاف انتخابات، مضبوط بلدیاتی نظام اور اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کا مطالبہ کیا۔

## مولانا ہدایت الرحمن (امیر جماعت اسلامی بلوچستان)

- بلوچستان کو دہائیوں سے نظر انداز کیا گیا حالانکہ یہ وسائل سے مالا مال صوبہ ہے۔
- عوام تعلیم، صحت، روزگار اور بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔
- صوبے کے وسائل اور ساحلی علاقوں کے باوجود عوام کو حقوق نہیں مل رہے۔
- شفاف حکمرانی اور وسائل پر بلوچستان کے عوام کا حق یقینی بنانے کا مطالبہ کیا۔

## ڈاکٹر محمد مشتاق خان (امیر جماعت اسلامی آزاد کشمیر)

- آزاد کشمیر میں مراعات یافتہ طبقہ مسلط ہے اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔
- جموں و کشمیر کی آزادی کے بغیر پاکستان کی آزادی مکمل نہیں۔
- سیاحت کے فروغ اور سیاحوں کے تحفظ کے لیے اقدامات کی ضرورت پر زور دیا۔

## عبدالرزاق عباسی (امیر جماعت اسلامی ہزارہ)

- ہزارہ کے حقوق اور داسو ڈیم کی تعمیر کا مطالبہ کیا۔
- ایبٹ آباد میں اسپتال بنانے اور علاقے کے وسائل پر مقامی حق دینے پر زور دیا۔

## عنایت اللہ خان (امیر جماعت اسلامی خیبر پختونخوا شمالی)

- وفاق پر خیبر پختونخوا کے ۲۲۰۰ ارب روپے کے واجبات کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔
- صوبے میں امن کی بحالی اور کاروباری سرگرمیوں کے تحفظ پر زور دیا۔

## عبدالواسع (امیر جماعت اسلامی خیبر پختونخوا وسطی)

- شہری علاقوں سے فوج کو سرحدوں پر تعینات کرنے اور پاک افغان سرحدی تجارت بحال کرنے کا مطالبہ کیا۔

## مجموعی پیغام

مختلف صوبائی قائدین نے اپنے خطابات میں ملک کے معاشی، سیاسی اور انتظامی مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے شفاف حکمرانی، عوامی حقوق کے تحفظ اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کی ضرورت پر زور دیا۔

امیر جماعت اسلامی کے خطاب سے قبل نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں محمد اسلم اور امیر جماعت اسلامی پنجاب جاوید قصوری نے اسٹیج سے ''نظام بدلو تحریک'' کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کی اپیلیں کیں۔ اس دوران کارکنان اور ذمہ داران کی جانب سے لاکھوں اور

کروڑوں روپے کے اعلانات کیے گئے۔ بعض افراد نے ایک کروڑ اور سوا کروڑ روپے تک کے انفرادی عطیات دینے کا اعلان کیا، جبکہ تمام عطیات دینے والوں کے نام اسٹیج سے بتائے گئے۔

ایک کارکن نے امیر جماعت اسلامی کی عینک ایک کروڑ بیس لاکھ روپے میں خریدی۔ بتایا گیا کہ اس سے قبل بھی یہی کارکن جماعت اسلامی کے ایک دھرنے میں یہی عینک ایک کروڑ روپے میں خرید چکے ہیں۔ اجتماع گاہ میں بھی بڑے بیگ دے کر شرکاء سے فنڈ جمع کیا گیا اور اسٹیج سے تقریباً ایک گھنٹہ تک فنڈ جمع کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

اس حوالے سے یہ تاثر ہے کہ کارکنان سے بڑے بڑے فنڈز جمع کرنے کی روایت بنتی جارہی ہے اور دھرنوں اور بڑے اجتماعات پر بہت زیادہ اخراجات کیے جاتے ہیں۔ تاہم جماعت کے اندر ارکان کے لیے ایسا کوئی واضح طریقہ کار موجود نہیں جس کے ذریعے وہ بیت المال کے آڈٹ یا فنڈز کے استعمال کا جائزہ لے سکیں۔

مزید برآں جماعت اسلامی کا اہم ترین تنظیمی اجتماع "اجتماع ارکان" جو پہلے کارکنان کی تنظیمی تربیت اور مشاورت کے لیے منعقد ہوتا تھا، اب کم ہوتا جارہا ہے۔ مقامی جماعتوں میں بھی اسے اکثر سال میں صرف ایک مرتبہ منعقد کرنے تک محدود کر دیا گیا ہے اور اس کی اثرپذیری کم ہو گئی ہے۔ اس بار کل پاکستان اجتماع عام کے موقع پر بھی اجتماع ارکان منعقد نہیں کیا گیا۔

آخر میں یہ بھی یاد رہے کہ کہ قاضی حسین احمد کے دورِ امارت میں نواز شریف نے جماعت اسلامی کو الیکشن کے لیے دس کروڑ روپے کا فنڈ دیا تھا۔

اختتامی سیشن میں امیر جماعت اسلامی پاکستان انجینئر حافظ نعیم الرحمن نے اپنے خطاب کا آغاز سورۃ الفتح کی آیات ۲۸–۲۹ کی تلاوت اور ترجمہ سے کیا۔ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی صفات، دین حق کے غلبے اور اہل ایمان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کا ذکر ہے۔

## تحریک ''بدل دو نظام'' کا اعلان

اپنے خطاب میں انہوں نے ملک میں ''بدل دو نظام'' تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا، جس کے تحت ملک بھر میں جلسے، جلوس اور دھرنے منعقد کیے جائیں گے۔ اس تحریک کا مقصد سیاسی اصلاحات اور نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی لانا بتایا گیا۔

## سیاسی و آئینی مطالبات

- اختیارات بیوروکریسی کی بجائے مقامی حکومتوں کو منتقل کیے جائیں
- بلدیاتی نظام کو آئین میں تحفظ دیا جائے۔
- ۲۶ویں اور ۲۷ویں آئینی ترامیم کو مسترد کرتے ہوئے ۱۹۷۳ء کے ائین کے تحفظ کا عزم ظاہر کیا گیا۔
- انتخابات کو ہائی جیک کرنے کی تمام کوششوں کی مخالفت کی جائے گی۔
- کسی بھی سیاسی جماعت پر پابندی لگانے یا سیاسی بنیاد پر قید و بند کی مخالفت کی گئی۔

## تنظیمی اہداف

- تحریک کے تحت ۵۰ لاکھ نئے ارکان شامل کرنے کا ہدف مقرر کیا گیا۔
- ملک بھر میں ۱۵ ہزار عوامی کمیٹیاں قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔
- نوجوانوں کے حوالے سے پروگرام
- پاکستان کی ۶۵ فیصد آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہونے کا ذکر کیا گیا۔
- نوجوانوں کو آئی ٹی تعلیم، ہنر مندی، اسٹارٹ اپس کے لیے آسان قرضے اور ٹیلنٹ ہنٹ پروگرام کی سہولیات دینے کا اعلان کیا گیا۔
- جنریشن زی کے لیے کنیکٹیویٹی پروگرام شروع کرنے کا اعلان کیا گیا۔

## خارجہ پالیسی اور عالمی امور

- آزاد خارجہ پالیسی اپنانے اور امریکہ کے زیر اثر پالیسیوں سے نکلنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔
- افغانستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی بات کی گئی۔
- فلسطین اور کشمیر کو جماعت اسلامی کی ریڈ لائن قرار دیا گیا اور اسرائیل کو تسلیم کرنے یا ابراہیمی معاہدے قبول کرنے کی کسی بھی کوشش کی مخالفت کی گئی۔

## کارکنان کے لیے ہدایات

- اللہ سے تعلق مضبوط کریں اور مالی معاملات میں شفافیت رکھیں۔
- تمام معاملات کو تحریری طور پر طے کریں۔
- صلہ رحمی کو برقرار رکھیں اور خود نمائی سے بچیں۔
- آئندہ انتخابات سے پہلے کسی امیدوار کا اعلان نہ کریں۔

## اختتامی دعا

خطاب کے بعد امیر جماعت اسلامی نے رقت آمیز دعا کرائی جس میں ملک و قوم کی سلامتی، ظلم کے خاتمے اور امت مسلمہ کے مسائل کے حل کے لیے دعائیں کی گئیں۔ لاکھوں شرکاء نے ہاتھ اٹھا کر آمین کہا اور اجتماع روحانی ماحول میں اختتام پذیر ہوا۔

اجتماع عام میں تقریباً ڈیڑھ سے پونے دو لاکھ افراد شریک ہوئے۔ شرکاء کے انفرادی اخراجات تقریباً ۵ ہزار سے ۱۰ ہزار روپے تک ہوئے ہوں گے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شرکاء کے لیے مجموعی طور پر ایک ارب روپے خرچ ہوئے، اور اتنے ہی انتظامات میں بھی لاگت آئی ہوگی۔ لاہور ایک خوشگوار اور تفریحی مقام کے طور پر سامنے آیا، جس نے دور دراز سے آنے والوں کے لیے اجتماع میں شرکت کو سہل اور خوشگوار بنا دیا۔

"بدل دو نظام" کا نعرہ اسلامی حمیت یا انقلابی جذبے سے عاری محسوس ہوا۔ اجتماع کے دوران

کسی بھی سیشن میں موجودہ سرمایہ دارانہ نظام پر کوئی سخت تنقید نہیں کی گئی۔ تقریروں اور سیشنز کا محور بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ عدل کی فراہمی اور اصلاحات پر رہا۔ اصل معنوں میں "بدل دو نظام" کا مطلب صرف سرمایہ دارانہ عدل کی فراہمی تک محدود تھا۔ اسٹیج سے انقلاب کے لیے لگائے جانے والے نعرے، جیسے "انقلاب زندہ باد"، زیادہ تر سیکولر یا جذباتی نظر آئے۔

اسٹیج سے کی جانے والی تقریروں میں اسلامی علمی رنگ کم تھا۔ صرف فجر کے بعد مختصر درس قرآن اور حدیث شامل تھے، اور اس دوران زیادہ تر شرکاء اپنی رہائشی کیمپوں میں نماز پڑھ کر آرام فرمارہے تھے۔ نمازوں کا اہتمام بھی زیادہ تاکید سے نہیں کیا گیا، ممکنہ وجہ یہ تھی کہ عموماً شرکاء نماز قضا پڑھتے ہیں۔

خواتین کی اجتماع میں شرکت کے انداز پر تنقید کی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ جماعت اسلامی کے دستور کی روح کے منافی تھا۔ اسٹیج پر ترانوں کے ساتھ میوزک شامل کرنا بھی شرعی طور پر قابل مذمت عمل تھا، اور اس پر اسٹیج سے احتجاج بھی کیا گیا، خصوصاً جب عربی نشید کے ساتھ میوزک شامل کیا گیا۔

اجتماع ارکان کا نہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جماعت اسلامی ایک populist پارٹی بنتی جارہی ہے اور اس پر ایک کرشماتی قیادت مسلط ہو رہی ہے۔ اس عمل سے ارکان نفاذاتی قوت اور شفافیت سے محروم ہو رہے ہیں، جبکہ قیادت عوام کی بھیڑ کو اپنا ہیرو تسلیم کرانے کی کوشش کر رہی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں جماعت کی جگہ بنانے کی راہ ہموار کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ جماعت اسلامی کی قیادت کو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھنے اور اس کے خلاف عملی اسلامی انقلابی صف بندی کرنے کی توفیق دے تاکہ پاکستان میں اصل نظام زندگی، جو سرمایہ داری کی شکل میں مسلط ہے، کے خلاف مؤثر جدوجہد کی جاسکے۔

## نوٹس و حوالہ جات

۱۔ نومبر ۲۰۲۵ کے اجتماع کو خالصتاً "اجتماعِ عام" رکھنے اور ارکان کا علیحدہ نشست نہ کرنے کے پیچھے

شوریٰ کے فیصلے کی جو وضاحتیں (اگرچہ پسِ پردہ ہیں) سامنے آتی ہیں، وہ کچھ یوں ہو سکتی ہیں:

عوامی لہر (Mass Mobilization): حافظ نعیم الرحمن صاحب کی حکمتِ عملی "سٹریٹ پاور" اور عوامی مقبولیت پر زیادہ مرکوز رہی ہے۔ شاید یہ سوچا گیا ہو کہ ارکان کی نشست پر وقت لگانے کے بجائے پوری توانائی عوامی طاقت دکھانے پر صرف کی جائے۔

سیاسی مصروفیت: "حق دو عوام کو" جیسی مہمات کی وجہ سے توجہ تنظیمی باریکیوں سے ہٹ کر عوامی ایجنڈے کی طرف مائل نظر آتی ہے۔

۲۔ جماعت کے دستور کے مطابق، ارکان وہ افراد ہیں جو بیعت کے ذریعے نظم کے پابند ہوتے ہیں۔ اجتماعِ ارکان محض ایک نشست نہیں بلکہ:

پوری جماعت کی کارکردگی کا احتسابی عمل ہوتا ہے۔

یہ ارکان کو براہِ راست قیادت سے سوال کرنے اور پالیسی سازی میں رائے دینے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اسے نظامِ جماعت میں "ریڑھ کی ہڈی" اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہیں سے نظریاتی پختگی اور تنظیمی نظم کو جلا ملتی ہے۔

۳۔ یہ مشاہدہ کہ موجودہ امیر اپنے اختیارات کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اور شوریٰ پر ان کی گرفت مضبوط ہے، جماعت کے اندرونی حلقوں میں ایک نئی بحث کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے:

جماعت اسلامی کی روایت ہمیشہ سے شورائیت کی رہی ہے، جہاں امیر جماعت شوریٰ کے تابع ہوتا ہے۔ اگر شوریٰ میں اختلافِ رائے کی آوازیں دب گئی ہیں یا وہ امیر کے فیصلوں کی محض توثیق کر رہی ہے، تو یہ جماعت کے روایتی مشاورتی مزاج کے لیے ایک بڑا چیلنج ہو سکتا ہے۔

حافظ نعیم صاحب کا کام کرنے کا طریقہ کار ایک جدید مینیجر یا "ٹیکنوکریٹ" جیسا ہے، جہاں نتائج (Results) کو تنظیمی روایات پر فوقیت دی جاتی ہے۔

# اسرائیل کی سامراجی حکمت عملی

جاوید اکبر انصاری

سامراج کی مقبوضات دو قسم کی ہیں۔ کچھ علاقوں پر سامراجی ممالک نے قبضہ کیا تو وہاں کے باشندوں کا قتل عام کر کے اپنی قوم کے باشندوں کو وہاں آباد کیا۔ ان مقبوضات میں امریکا، کینیڈا اور آسٹریلیا وغیرہ شامل ہیں۔ ان علاقوں کو نو آبادیات (settler colonies) کہنا درست ہے۔ کچھ دوسرے علاقوں میں سامراجی قوت (برطانیہ، فرانس، ولندیز) مفتوحہ علاقوں کے عوام کا قتل عام نہ کر سکی۔ مثلاً ہندوستان، انڈونیشیا، ساؤتھ افریقا وغیرہ۔ یہ نو آبادیات نہیں بلکہ کالونیاں ہیں۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ نو آبادیات میں سامراج نے علاقائی توسیع پسندی اور بچی کھچی مقامی آبادی کی بے دخلی کی حکمت عملی اختیار کی ہے۔ جب کہ کالونیوں میں سامراج مقامی باشندوں کے معاشی اور معاشرتی استحصال پر انحصار کرتا ہے۔ یہ استحصال کالونی کی آزادی کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور کالونی نیو کالونی میں تبدیل ہو جاتی ہے جس پر سامراجی تسلط برقرار رہتا ہے۔

اسرائیل ایک نو آبادیات ہے۔ کالونی یا نیو کالونی نہیں ہے [۱]۔ امریکا کی طرح اسرائیل بھی ایک جنگ جو ریاستی اور معاشی نظام ہے جو علاقائی توسیع پسندی کو اپنی پالیسی کا مرکز اور محور بنائے ہوئے ہے۔ اپنے قیام سے لے کر آج تک اسرائیل کا اولین مقصد مسلمانوں کا قتل عام اور ان کی علاقائی بے دخلی رہا ہے کیونکہ اس کے بغیر عظیم اسرائیل کا جو خواب صہیونیت نے دیکھا تھا وہ پورا نہیں ہو سکتا [۲]۔ ابھی تو غزہ میں اسرائیل نے صرف ستر ہزار مسلمان شہید کیے ہیں یعنی ان تیس لاکھ مسلمانوں کا دو فیصد جن کے قتل عام اور بے دخلی کا وہ ارادہ رکھتی ہے [۳]۔ ان تیس لاکھ مسلمانوں کے قتل عام میں نہ اوسلو معاہدہ نہ ابراہیمی مفاہمت رکاوٹ بننے دیے جائیں گے [۴]۔

انیسویں صدی کے وسط سے صہیونیت مسلمانوں سے برسرپیکار رہی ہے۔ اپنی ریاست بنانے سے پہلے اس کو گاہے گاہے برطانوی سامراج کی حمایت حاصل رہی۔ عالمی صہیونی تنظیم World Zionist Organization کے قیام کے بعد عالمی یہودی کمیونٹی سے اسرائیل کے لیے فنڈ بھی جمع کیے جاتے رہے اور قیام ریاست کے حق میں سیاسی رائے بھی ہموار کی جاتی رہی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے بڑے پیمانے پر یورپ کے یہودی فلسطین منتقل ہونا شروع ہوئے اور انہوں نے فلسطینی زمینوں پر قبضہ اور مسلمانوں کی بے دخلی کا عمل شروع کیا۔ شروع ہی سے یہودی آبادکاروں نے مسلمان محنت کش عوام کی جگہ لینے کی پالیسی اختیار کی اور ان کی آمدورفت اور مواصلت پر پابندیاں عائد کی جاتی رہیں۔ یہودی ٹریڈ یونین تنظیموں نے مسلمان محنت کشوں کی بے دخلی اور اسرائیلی ریاستی نظام کی تشکیل میں ایک کلیدی کردار ادا کیا[۵]۔

۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء تک کے دورانیوں میں مسلمانوں نے یہودی آبادکاروں کے خلاف جہادی مزاحمتوں کا سلسلہ جاری رکھا جس کو برطانوی سامراج نے یہودی آبادکاروں کے تعاون سے کچل دیا[۶]۔

اقوام متحدہ نے اپنے قیام کے فوراً بعد اسرائیل کو تسلیم کرنے اور فلسطین کی تقسیم کی قرارداد منظور کی۔ تب یہودی فلسطین کی آبادی کا ۳۸ فیصد تھے۔ اقوام متحدہ نے یہودیوں کے لیے فلسطین کی ۵۵ فیصد زمینیں مختص کیں لیکن اسرائیل فوج نے ۷۷ فیصد علاقے پر قبضہ کر لیا۔ تحریک نکبہ (Nakba) کے ذریعے تقریباً دس لاکھ مسلمانوں کو فلسطین سے نکال دیا گیا (یہ اس وقت کی مجموعی فلسطینی آبادی کا تقریباً ۶۵ فیصد تھے)[۷]۔ ۱۹۷۳ء کے جہاد کے بعد اسرائیل نے مغربی ساحل اور مشرقی یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اوسلو معاہدے کے بعد مغربی ساحل پر پی ایل او PLO کی پٹھو حکومت قائم کی گئی جو ان علاقوں پر اسرائیلی پالیسیوں پر عمل درآمد اور عمومی نگہداشت کا ذریعہ بنی ہوئی ہے[۸]۔ اسی وقت سے اسرائیل نے جنوبی لبنان، شام اور اردن پر وقتاً فوقتاً قبضہ کرنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ اس جارحیت کو فروغ دینے

میں اسرائیل کا بنیادی حلیف امریکا رہا ہے جس نے ۱۹۴۷ء سے ۲۰۲۵ء تک اسرائیل کو تین کھرب ڈالر کی امداد فراہم کی ہے اور حالیہ جنگ میں ۱۸ ارب ڈالر کا جنگی سامان اسرائیل کو فراہم کیا ہے۔ آج اسرائیل کا جنگی صنعتی شعبہ عملاً امریکی جنگی معیشت کا حصہ بن گیا ہے[۹]۔ امریکا اسرائیل کا حلیف ہے کیونکہ اس نے بھی اپنے قیام کے وقت سے لیکر انیسویں صدی کے اواخر تک اسی لاکھ ریڈ انڈینوں کا قتل عام جاری رکھا تھا۔

موجودہ جنگ ۲۰۲۲ء تا ۲۰۲۵ء کے دوران غزہ میں شکست کے باوجود اسرائیل نے جنوبی لبنان پر تسلط حاصل کر لیا۔ ایران پر حملہ آور ہوا۔ شام میں گھس آیا اور اسد کی بے دخلی میں اس نے کلیدی کردار ادا کیا اور مغربی ساحل سے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کو بے دخل کرنے اور تیس سے زیادہ نئی یہودی آبادیوں کی منظوری دی[۱۰]۔

اسرائیل ان معنوں میں ایک منفرد سامراج ہے کہ وہ اپنے سرپرست یعنی امریکا پر انحصار کو کم کرنے کی جستجو کر رہا ہے۔ اس کو سالانہ پانچ ارب ڈالر کی امریکی امداد ملتی ہے لیکن اس نے اپنی دفاعی صنعت کو تین کھرب تک پہنچا دیا ہے۔ اسرائیلی ریاست ایک فوجی معیشت ہے[۱۱]۔ یہ اسرائیلی فوج (آئی ڈی ایف) ہی ہے جس نے یورپی، افریقی، عرب، روسی یہودیوں کو اسرائیلی بنا دیا ہے[۱۲]۔ اسرائیلی فوج نے فلسطینی مسلمانوں کو مجبور، لاچار اور بے کس بنا دیا ہے اور یہی سلوک وہ شامی، لبنانی، مصری اور ایرانی مسلمانوں کے ساتھ روا رکھنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے علاقے میں موجود مسلم ریاستوں کی تقسیم در تقسیم کی خواہاں ہے اور ان کو اپنی باج گزار بنانے کا عزم رکھتی ہے۔

اسرائیل سیاسی طور پر ایک خود مختار ریاست ہے[۱۳] جو اپنے سرپرست (امریکا) سے اپنے تزویراتی عزائم کو قبول کروانے کی مستقل کوشش جاری رکھتی ہے۔ اس کے لیے اس نے ایک مضبوط جماعتی جتھا (اسرائیل لابی اے پیک) کارفرما کر رکھی ہے جو امریکی سیاست اور معیشت پر حاوی تو نہیں لیکن ان کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اور کم از کم ابھی تک اس کی کارفرمائی متاثر کن رہی ہے۔ امریکا کی یہودی لابی اور اس کی برادر تنظیموں نے امریکی

صدارت، مقننہ، میڈیا اور تھنک ٹینکس سے مستقل بنیادوں پر اشتراک عمل جاری رکھا ہوا ہے۔ آج وہ بہت سے امریکیوں کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہو گئی ہے کہ اسرائیل کے مخالفت یہودیوں کی دوسری جنگ عظیم کے دوران کی جانے والی نسل کشی (ہولوکاسٹ) کی حمایت ثابت ہو سکتی ہے۔ امریکی کمپنیوں نے بڑے پیمانے پر اسرائیل میں صنعت کاری کی ہے اور امریکی اور اسرائیلی آئی ٹی کے شعبے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں[۱۴]۔

ٹرمپ اور بائیڈن کے دور صدارت میں اسرائیل کا اثر امریکا کی وسط ایشیائی پالیسی پر یقیناً بڑھا ہے، لیکن اس کے باوجود امریکا اور اسرائیل کے قومی مفادات میں ہم آہنگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ مصر کو فوجی آمریت کے ماتحت رکھنا امریکا کے طویل المدت مفادات میں نہیں لیکن مصر میں جمہوریت کی آمد کا مطلب یقیناً فلسطینی مسلمانوں کی حمایت میں اضافہ ہو گا۔ یہ سبق ہم نے اخوانی حکومت کی ۲۰۱۳ء کی برطرفی سے سیکھا ہے۔ اسی طرح ایران کا نیوکلیئر ہتھیاروں کا حصول بھی امریکا کے لیے قابل برداشت ہو سکتا ہے کیونکہ ۲۰۲۵ء کے امریکی / اسرائیلی ناکام حملوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ایران کی اسلامی ریاست کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور ایران کی نیوکلیئرائزیشن مشرق وسطیٰ میں قوت کا توازن اسی طرح قائم کر دے گی جس طرح کہ برصغیر پاک وہند میں ہے۔

بہت سے امریکی پالیسی ساز آج یہ کہہ رہے ہیں کہ ایران کے نیوکلیئر ہتھیاروں سے امریکا کو کوئی خطرہ نہیں اور مشرق وسطیٰ میں امریکی مداخلت دوسرے اہم ترین محاذوں سے توجہ ہٹانے کا باعث بن رہی ہے۔ ان محاذوں میں سب سے اہم چین ہے۔ ٹرمپ کی حالیہ خارجی تزویراتی حکمت عملی (strategic planning) نے لاطینی امریکا پر تسلط کو قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ ٹرمپ وینزویلا اور کولمبیا پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ گرین لینڈ پر قبضے کے بھی ارادے ہیں۔ ان حالات میں اگر امریکا کو یقین آ جائے کہ وہ ویت نام اور افغانستان کی طرح مشرق وسطیٰ کی جنگ نہیں جیت سکتا تو اسکو اس علاقے سے فرار کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، جس کا مطلب اسرائیل کی پشت پناہی کو ترک

کر دینا ہو گا۔ اسرائیل توسیع پسندی کی اپنی مہمات امریکی اعانت (فوجی اور سفارتی) کے بغیر جاری نہیں رکھ سکتا۔

پیو ریسرچ کے ایک سروے کے مطابق (جو اپریل ۲۰۲۵ء میں کیا گیا) آج ۵۳ فیصد امریکی اسرائیل کے مخالف ہیں اور اسرائیل کی پالیسیوں کی مذمت امریکی یہودی بھی کر رہے ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ غزہ کی طویل جنگ صرف اس لیے جاری رکھی جا رہی ہے تاکہ نیتن یاہو جیل جانے سے بچا رہے۔ پیو کے ایک اور سروے کے مطابق (جو جون ۲۰۲۵ء میں لیا گیا) توقع یہ ہے کہ نیتن یاہو اکتوبر ۲۰۲۶ء میں قومی انتخابات میں شکست کھا جائے گا۔

اس کے باوجود اسی سروے کے مطابق ستر فیصد اسرائیلی غزہ میں مظالم جاری رکھنے حامی ہیں لیکن اسرائیلی فوج کے ایک جنرل نے غزہ، لبنان اور شام میں اسرائیلی فوج میں مایوسی اور ذہنی امراض پھیلنے کی شکایت کی ہے اور بہت سے سپاہی فرار بھی ہو گئے ہیں اور حکم عدولی کے جرم میں گرفتار بھی کر لیے گئے ہیں۔

اس سب کے باوجود امریکا میں اسرائیلی لابی کے اثر و رسوخ میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ امریکی فوجی اور معاشی امداد جاری ہے اور موساد اور سی آئی اے کا اطلاعاتی نظام انضمام کے کئی مراحل طے کر چکا ہے۔ ایرانی اور شامی اسرائیلی مہمات میں یہ اطلاعاتی تعاون نہایت اہمیت اختیار کر گیا۔ فی الحال امریکا اسرائیل کی توسیع کی پالیسی کی بھرپور حمایت جاری رکھے ہوئے ہے[۱۵]۔

توسیع پسندی کی یہ حکمت عملی اسرائیل کی سرحدوں کے پھیلاؤ کی نہیں ہے بلکہ علاقے میں راجواڑوں کے قیام کو فروغ دینے کی ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ مغربی ساحلی رجواڑے کو بتدریج مسلمانوں سے خالی کروایا جائے اور یہودیوں کو وہاں آباد کیا جائے۔

۲۔ شام کو چار رجواڑوں میں تقسیم کیا جائے: دوسنی راجواڑے، ایک علوی راجواڑہ اور ایک دروز راجواڑہ قائم کیا جائے۔

۳۔ عراق کو تین رجواڑوں میں تقسیم کیا جائے۔ بغداد، موصل اور بصرہ میں یہ رجواڑے قائم کیے۔

۴۔ مصر کو دو رجواڑوں میں تقسیم کیا جائے اور جنوب کا رجواڑہ قبطی عیسائیوں کو سونپ دیا جائے۔

۵۔ ایران سے اس کے عرب اکثریتی علاقے علیحدہ کر دیے جائیں اور اسلامی حکومت کے خاتمے کی مہمات جاری رکھی جائیں۔

یہ تمام رجواڑے ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں۔ ان پر اسرائیلی پٹھو حکومتیں مسلط رہیں۔ یہ اصولاً آزاد ہوں اور ان میں جمہوری کھیل کھیلا جاتا ہے لیکن عملاً اسرائیلی ایمپائر کے ایسے ہی حصے ہوں جیسے برطانیہ، گال اور یونان قدیم رومن ایمپائر کے حصے ہوا کرتے تھے۔

اس حکمت عملی کو ناکام بنانے کے لیے موثر مداخلت کی امید عرب حکومتوں سے نہیں کی جا سکتی۔ یہ سب اسرائیل سے مفاہمت پر آمادہ ہیں اور اس مفاہمت کو فروغ دینے کیلئے جلد یا بدیر کوئی بھی قیمت دینے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ یہ ذمہ داری حماس اور حزب اللہ کو قبول کرنی چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ لبنان، شام اور اردن میں اسلامی حکومتیں قائم ہوں تاکہ ایرانی فوج کو اسرائیل پر زمینی حملے کے لیے راستہ ملے۔ اسرائیل کی ہوائی برتری کا توڑ زمینی جنگ ہی سے مہیا کیا جا سکتا جہاں اسرائیلی فوج کی کمزوریاں غزہ کے محاذوں پر ناکامی نے عیاں کر دی ہیں۔

دوسرا ہدف اسرائیل میں خانہ جنگی کو فروغ دینا ہے۔ تل ابیب اور مغربی ساحلی علاقوں میں فدائی حملے شروع ہو گئے ہیں جن کے رد عمل کے طور پر اسرائیلی مقننہ نے سیکورٹی نظام کو مزید سخت بنانے کے لیے قانون سازی کی ہے اور ایک ہزار کے قریب یورپی یہودی اسرائیل سے نقل مکانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اسرائیل پر ایرانی بری حملہ اسی وقت پر بار آور ثابت ہو سکتا ہے جب اسرائیل میں خانہ جنگی اپنے عروج پر ہو۔

تیسرا ہدف امریکا کو مشرق وسطیٰ سے فرار اختیار کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ اس کی ذمہ داری

پوری دنیا کی اسلامی جماعتوں اور گروہوں پر عائد ہوتی ہے۔ غزہ میں ٹرمپ منصوبے کے تحت جو عالمی "امن فوج" تعینات کی جارہی ہے اس میں مسلم ممالک کی شرکت کی شدت سے مخالفت کرنا چاہیے۔ امریکی مصنوعات اور امریکی سرمایہ کاری کی بائیکاٹ کی مہمات (جو ابھی تک بالکل ناکام رہی ہیں) کو قومی سیاسی ایجنڈے کا حصہ بنانا چاہئے تاکہ امریکا کو اسرائیلی حمایت اور مسلم دنیا میں مداخلت کی ناقابل برداشت قیمت دینا پڑے۔ امریکی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسرائیلی لابی کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لیے منظم اور متحرک ہو جائیں اور ان حلقوں سے عمل کی راہیں تلاش کریں جو اس سلسلے میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

یہ طویل المدت جہاد ہے۔ ہمیں اس عزم کے ساتھ اس جہاد کو جاری رکھنا ہے کہ اسرائیلی ریاست کا وجود ہمیں کسی حالت میں، کسی قسم کی شرائط کی بنیاد پر، کسی صورت میں قبول نہیں۔ ہم جلد یا بدیر فلسطین میں ایک اسلامی ریاست قائم کر کے رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

## نوٹس و حوالہ جات

۱۔اسرائیل کی حکمت عملی میں دونوں اقسام کے عناصر ملتے ہیں گو کہ وبالآخر مغربی کنارے و غزہ کے علاقوں کو مکمل طور پر نو آبادی میں تبدیل کرنے کا عزم رکھتا ہے: مغربی کنارے اور غزہ میں اسرائیل ایک "کالونی" کی طرح کام کرتا ہے جہاں وہ زمین پر قابض ہے، نقل و حمل کو کنٹرول کرتا ہے اور فلسطینی محنت کشوں کو سستی لیبر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اسرائیل کے اندرونی علاقے میں یہ ایک "Settler State" ہے جہاں مقامی آبادی کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور ریاستی ڈھانچہ مکمل طور پر نو آبادیاتی (Zionist) نظریات پر استوار ہے۔

۲۔صہیونی نظریے میں Eretz Yisrael (ارضِ اسرائیل) کا تصور محض مذہبی نہیں بلکہ ایک جغرافیائی اور سیاسی توسیع پسندی کا منصوبہ ہے:

تزویراتی گہرائی: اسرائیل کا جنگجو معاشی نظام ( Military-Industrial

Complex) مستقل جنگ اور قبضے پر استوار ہے۔ یہ معیشت ہتھیاروں کی فروخت اور "میدانِ جنگ میں آزمودہ"(Battle-tested) ٹیکنالوجی پر چلتی ہے۔

بے دخلی کی پالیسی: ۱۹۴۸ء سے لے کر موجودہ غزہ کی صورتحال تک، ہر فوجی کارروائی کا ایک ضمنی مگر واضح مقصد فلسطینیوں کو پڑوسی ممالک (مصر یا اردن) کی طرف دھکیلنا رہا ہے تاکہ زمین کو مقامی باشندوں سے "پاک" کیا جاسکے۔

۳۔ متن میں غزہ میں جاری جانی نقصان اور مستقبل کے عزائم کا جو ذکر کیا گیا ہے، اسے بین الاقوامی قانون کے ماہرین "Incremental Genocide" (تدریجی نسل کشی) کا نام دیتے ہیں۔ اگرچہ جانی نقصان کے سرکاری اعداد و شمار لرزہ خیز ہیں، لیکن بنیادی ڈھانچے (ہسپتالوں، یونیورسٹیوں اور بیکریوں) کی منظم تباہی اس بات کا ثبوت ہے کہ مقصد صرف جنگ نہیں بلکہ اس زمین کو "ناقابلِ رہائش" بنانا ہے تاکہ باقی ماندہ آبادی خود ہجرت کر جائے۔ جیسا کہ متن میں اشارہ کیا گیا ہے، "عظیم اسرائیل" کے خواب میں فلسطینیوں کی موجودگی ایک "آبادیاتی خطرہ" (Demographic Threat) سمجھی جاتی ہے، جسے ختم کرنا صہیونی ریاست اپنی بقا کے لیے ضروری سمجھتی ہے۔

۴۔ متن کی یہ بات کہ اوسلو معاہدہ یا ابراہیمی مفاہمت (Abraham Accords) اس عمل میں رکاوٹ نہیں بنیں گے، تاریخی طور پر درست معلوم ہوتی ہے۔

اوسلو معاہدے نے اسرائیل کو "امن" کا لبادہ فراہم کیا جبکہ پس پردہ مغربی کنارے میں بستیوں کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہوا۔

ابراہیمی مفاہمت کا مقصد فلسطین کے مسئلے کو علاقائی سیاست سے الگ کر کے اسرائیل کو عرب دنیا میں قبولیت دلانا تھا، تاکہ وہ فلسطینیوں کے خلاف "آخری حل" (Final Solution) کی طرف بڑھتے ہوئے سفارتی تنہائی کا شکار نہ ہو۔

۵۔ ہستادروت (Histadrut) نامی تنظیم نے "صرف یہودی محنت" کا نعرہ لگایا۔ اس پالیسی کا مقصد فلسطینی عربوں کو معاشی طور پر مفلوج کرنا تھا۔ انہوں نے یہودی کارخانوں اور فارمز سے عرب مزدوروں کو نکال کر وہاں نووارد یہودی آبادکاروں کو بسایا۔ ہستادروت محض ایک ٹریڈ یونین نہیں تھی بلکہ اس نے اسرائیل کے قیام سے پہلے ہی ہسپتال، اسکول اور بینک قائم کر لیے تھے، جو بعد میں اسرائیلی ریاست کا ڈھانچہ بنے۔

۶۔ یہ دور فلسطینی مزاحمت کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ فلسطینیوں نے چھ ماہ طویل ملک گیر

ہڑتال کی جو اس وقت کی طویل ترین نو آبادیاتی مخالف ہڑتال تھی۔ برطانیہ نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے فضائی بمباری اور اجتماعی سزاؤں کا سہارا لیا۔ اس سلسلے میں صہیونی ملیشیا(Haganah) کا کردار اہم تھا۔ برطانوی فوج نے صہیونی آبادکاروں کو تربیت دی اور "سپیشل نائٹ سکواڈز" تشکیل دیے، جنہوں نے فلسطینی دیہاتوں پر حملے کیے۔ یہی تربیت یافتہ گروہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی فوج (IDF) کی بنیاد بنا۔

۷۔نکبہ (Nakba) ایک منظم نسلی تطہیر Ethnic Cleansing تھی۔ اسرائیلی فوج (ہگانا اور ارگن) نے "دالت پلان"(Plan Dalet) کے تحت جان بوجھ کر فلسطینیوں کا قتل عام کیا تاکہ مقامی آبادی میں خوف پیدا کر کے انہیں بے دخل کیا جا سکے۔

۸۔۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے کے بعد قائم کردہ فلسطینی اتھارٹی (PA) عملاً اسرائیل کے ایک سیکیورٹی ونگ کے طور پر کام کرتی ہے۔ وہ فلسطینیوں کی مزاحمت کو کچلتی ہے تاکہ اسرائیل کی غیر قانونی بستیوں(Settlements) کو تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں سامراج براہِ راست حکمرانی کے بجائے مقامی ایلیٹ(Elite) کو استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔

۹۔امریکا کی طرف سے دی جانے والی سالانہ اربوں ڈالر کی فوجی امداد دراصل ایک دائرہ جاتی معیشت (Circular Economy) ہے۔ یہ پیسہ براہِ راست امریکی اسلحہ ساز کمپنیوں (Lockheed Martin, Raytheon وغیرہ) کے پاس جاتا ہے۔ برطانیہ کے کارخانے F-35 طیاروں کے اہم پرزے بناتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اسرائیل غزہ میں بمباری جاری رکھے گا، مغربی اسلحہ ساز اداروں کے منافع میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

یہ نکتہ کہ اسرائیل کا جنگی شعبہ امریکی معیشت کا حصہ بن چکا ہے، حالیہ حقائق سے ثابت ہے۔

- حالیہ جنگ میں ۱۸ بلین ڈالر کی فراہم کی گئی رقم محض اسلحہ نہیں بلکہ امریکی اسلحہ ساز کمپنیوں کے لیے ایک سرمایہ کاری ہے۔
- امریکا کے لیے اسرائیل ایک "ناقابلِ شکست طیارہ بردار جہاز" (Unsinkable Aircraft Carrier) کی مانند ہے، جس کے ذریعے وہ پورے مشرقِ وسطیٰ کے وسائل اور توانائی کے راستوں کو کنٹرول کرتا ہے۔

۱۰۔شام میں بشار الاسد کی بے دخلی اور اسرائیل کی مداخلت اس خطے کے جغرافیے کو بدلنے کی ایک بڑی کوشش ہے۔ شام میں مستحکم حکومت کا خاتمہ اسرائیل کو گولان کی پہاڑیوں سے آگے بڑھنے اور دمشق تک اثر و رسوخ بڑھانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شام کی تبدیلی کا مقصد ایران سے لبنان (حزب اللہ) تک جانے والی سپلائی لائن کو کاٹنا تھا، جس میں اسرائیل نے فضائی بمباری اور زمینی مداخلت کے ذریعے کلیدی کردار ادا کیا۔ لبنان پر حالیہ تسلط اسرائیل کی اسی پرانی پالیسی کا حصہ ہے جس کا مقصد "بفر زون" (Buffer Zone) قائم کرنا ہے۔ جنوبی لبنان کا پانی (دریائے لیطانی) اور زرخیز زمین ہمیشہ سے صہیونی توسیع پسندی کے نشانے پر رہے ہیں۔ لبنان میں مداخلت کا ایک مقصد وہاں موجود فلسطینی مہاجرین کے کیمپوں کو غیر مستحکم کرنا بھی ہے تاکہ وہ دوبارہ کبھی واپسی کا نہ سوچ سکیں۔ غزہ کی جنگ کی آڑ میں مغربی ساحل پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ نو آبادیاتی سامراج Settler Colonialism کی بدترین شکل ہے۔ ایک لاکھ مسلمانوں کی بے دخلی "نکبہ" کا تسلسل ہے۔ اسرائیل نے مغربی ساحل کو چھوٹے چھوٹے جزیروں (Enclaves) میں بانٹ دیا ہے تاکہ فلسطینیوں کی زندگی اجیرن کر دی جائے۔ نئی یہودی بستیوں کی منظوری بین الاقوامی قانون کی کھلی خلاف ورزی ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا، امریکی پشت پناہی اسے تحفظ فراہم کرتی ہے۔

۱۱۔ اسرائیل نے امریکی امداد (جو کہ اس کی جی ڈی پی کا محض اسے ۲ فیصد رہ گئی ہے) کو ایک بیج (Seed Money) کے طور پر استعمال کیا تاکہ اپنی تین کھرب ڈالر کی دفاعی اور ہائی ٹیک صنعت کھڑی کر سکے۔ آج اسرائیل دنیا کو ڈرونز، سائبر ہتھیار (جیسے پیگاسس) اور میزائل ڈیفنس سسٹم بیچ رہا ہے۔ یہ معاشی قوت اسے موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ بعض اوقات امریکی دباؤ کو بھی خاطر میں نہ لائے۔

اسرائیل کی معیشت کا بڑا حصہ براہِ راست یا بالواسطہ عسکری تحقیق (R&D) سے جڑا ہوا ہے، جس سے ہمارے "فوجی معیشت" والے نکتے کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۲۔ فوج نے مختلف پس منظر کے یہودیوں کو ایک "قوم" میں ڈھال دیا ہے۔ اسرائیل میں لازمی فوجی سروس کا مقصد صرف دفاع نہیں بلکہ مراکشی، روسی، پولش اور ایتھوپین یہودیوں کو ایک مشترکہ "صہیونی شناخت" اور "جنگجو ذہنیت" کے گرد اکٹھا کرنا ہے۔ اس مشترکہ طاقت کا پہلا ہدف مقامی آبادی کو اتنا لاچار کر دینا ہے کہ وہ مزاحمت کا تصور ہی نہ کر سکیں۔

۱۳۔ اسرائیل نے روس، چین اور بھارت کے ساتھ بھی گہرے دفاعی اور معاشی تعلقات استوار کیے ہیں تاکہ اگر کبھی واشنگٹن سے دباؤ بڑھے، تو اس کے پاس متبادل راستے موجود ہوں۔ حالیہ جنگوں (۲۰۲۵-۲۰۲۲) کے دوران ہم نے دیکھا کہ امریکا کی بعض "نصیحتوں" کے باوجود اسرائیل نے اپنے جارحانہ عزائم (مثلاً لبنان پر قبضہ یا ایران پر حملہ) کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، جو اس کی بڑھتی ہوئی

تزویراتی خود مختاری (تمناؤں) کی علامت ہے۔

۱۴- جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اب یہ رشتہ صرف امداد تک محدود نہیں رہا بلکہ دونوں ممالک کے کارپوریٹ سیکٹرز ایک دوسرے میں ضم ہو چکے ہیں۔ انٹیل (Intel)، مائیکروسافٹ اور گوگل جیسی بڑی امریکی کمپنیوں نے اسرائیل میں اپنے بڑے تحقیقی مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ اسرائیل کی یونٹ ۸۲۰۰ (فوجی انٹیلیجنس یونٹ) سے نکلنے والے ماہرین امریکی سلیکون ویلی میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔

۱۵- ہمارے تجزیے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسرائیل اپنی تاریخ کے نازک ترین موڑ پر کھڑا ہے۔ ایک طرف اس کے توسیع پسندانہ عزائم ہیں اور دوسری طرف اس کی اپنی فوج کی شکستگی اور عالمی تنہائی۔ اگر امریکا واقعی "ویت نام ماڈل" پر عمل کرتے ہوئے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے، تو اسرائیل کا "عظیم اسرائیل" کا خواب ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ جائے گا۔

# افغان معیشت کا استحکام فروغ پا رہا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

ورلڈ بینک کے نومبر اور دسمبر ۲۰۲۵ء کے تجزیے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ افغان معیشت قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے۔ ۲۰۲۶ء میں بھی شرح نمو (GDP growth rate) مثبت رہنے کا امکان ہے۔ ورلڈ بینک اب یہ نہیں کہتا کہ افغانستان میں فاقہ کشی ہے یا بے روزگاری بڑھ رہی ہے. سطح غربت میں اضافے کا وہ جو دعویٰ کرتا ہے اس کو اس تجزیے میں دیے گئے اعداد و شمار غلط ثابت کرتے ہیں۔

ورلڈ بینک اقرار کرتا ہے کہ افغانستان میں قیمتیں مستحکم ہیں۔ دولت افزائی (سرمایہ کاری) کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے اور حکومتی محصولیاتی وسائل (fiscal reserve) بڑھ رہے ہیں۔

نومبر ۲۰۲۵ء میں صارفین قیمت اشاریہ (سی پی آئی) صرف ایک اعشاریہ دو فیصد بڑھا۔ گوشت، دودھ، سبزیوں، شکر اور مشروبات کی قیمتوں میں ایک فیصد تک معتدل اضافہ ریکارڈ کیا گیا اور خوردنی تیل کی قیمتیں پانچ فیصد کم ہوئیں۔

غیر خوردنی تورم (non-food inflation) کی شرح نمو صفر اعشاریہ آٹھ فیصد رہی۔ مواصلاتی قیمتیں صفر اعشاریہ چار فیصد کم ہوئیں۔ کپڑوں کی قیمتوں میں دو فیصد کمی واقع ہوئی۔ گھریلو استعمال کی اشیاء (household goods) میں ایک اعشاریہ ایک فیصد کمی ہوئی۔ دواؤں کی قیمتوں میں (جس کی وجہ پاکستانی پابندیاں ہیں) چار فیصد اضافہ ہوا جسکی وجہ دوائیوں کی ترسیلی لاگت میں اضافہ ہے۔

۲۰۲۵ء میں افغانی کی بین الاقوامی شرح تبادلہ میں چھ فیصد اضافہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ افغانستان میں اپنے تجارتی ساتھیوں (ایران، پاکستان، بھارت, ازبکستان اور متحدہ عرب امارات) کے مقابلے میں شرح افراط زر کم رہی۔ دسمبر ۲۰۲۵ء میں اوسطاً ایک ڈالر ۶۶ افغانی

کے برابر رہا۔

۲۰۲۵ء میں افغانستان کے تجارتی خسارے میں ۱۲ فیصد اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ پاکستانی پابندیوں کے باعث درآمدات کے ترسیلی اخراجات میں اضافہ رہا ہے۔ درآمدات اب نسبتاً طویل اور دشوار گزار راستوں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ افغانستان کی درآمداتی مانگ (import demand) میں اضافہ بھی تجارتی خسارے کے بڑھنے کا ایک سبب رہا ہے۔ پاکستانی پابندیوں سے افغان برآمدات بھی متاثر ہوئیں۔ خوردنی برآمدات مجموعی افغان برآمدات کا ۸۴ فیصد بنتی ہیں۔ برآمدات ۲۵ فیصد گریں۔ کوئلے کی برآمدات صفر رہیں۔

پاکستانی پابندیوں کے نتیجے میں بھارت کی گرفت افغان تجارت پر بڑھ رہی ہے۔ دسمبر ۲۰۲۵ میں صرف تین فیصد افغان برآمدات پاکستان کو حاصل ہوئیں جبکہ بھارت کو افغان برآمدات میں ۶۱ فیصد حاصل ہو گیا۔ اب بھارت افغانستان کا سب سے بڑا برآمدی خریدار ملک بن گیا ہے۔ افغان تجارتی راستے بند ہونے سے خیبر پختون خواہ معیشت کو کئی بلین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

پاکستانی بندشوں سے افغان درآمدات متاثر نہیں ہوئیں۔ افغانستان متبادل درآمدی راستوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ۲۰۲۵ء میں افغان درآمدات پانچ فیصد بڑھیں۔ مشینری اور بجلی کے سامان کی درآمدات ۳۵ فیصد بڑھیں اور معدنی (mineral) درآمدات میں ۳۳ فیصد اضافہ ہوا۔ ۲۰۲۵ء میں صنعتی خام مال (industrial raw material) افغان برآمدات کا ۵۰ فیصد رہا اور اسمیں ۳۵ فیصد اضافہ ہوا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ افغانستان کی پیداواری سکت (factor of productivity) میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور وہاں صنعت کاری کا فروغ جاری ہے۔

ایران افغانستان کا سب سے بڑا درآمداتی شریک کار ہے۔ اس کا حصہ افغان مجموعی درآمدات میں ۲۰۲۵ء میں ۳۱ فیصد رہا۔ متحدہ عرب امارات نے ۱۸ فیصد افغانی درآمدات حاصل کر سکا۔ چین کا حصہ ۸ فیصد رہا۔ ۲۰۲۵ء میں بندشوں کے باوجود پاکستان ۱۰ فیصد درآمدات

حاصل کر سکا۔ افغانستان بھارتی اشیاء کا بڑا خریدار نہیں۔ ۲۰۲۵ء میں اس کا حصہ افغانی درآمدات میں تقریباً ایک فیصد رہا۔

افغان معیشت کی سب سے نمایاں کامیابی اس کی مالیاتی (fiscal) پالیسیوں سے عیاں ہوتی ہے۔ ۲۰۲۵ء میں افغانستان کی حکومت کی مجموعی آمدنی میں ۱۸ فیصد اضافہ ہوا۔ پاکستانی تجارتی بندشیں حکومتی محصولیات کو متاثر نہ کر سکیں جو محصولیاتی انتظامی صلاحیت اور بڑھتے ہوئے عوامی تعاون کا مظہر ہے۔ ٹیکس محصولات میں ۲۰۲۵ء میں ۳۵ فیصد اضافہ ہوا جو ٹیکس انتظامیہ کی بہتر کارکردگی کا نتیجہ رہا۔ ۲۰۲۵ء میں کسٹمز محصولات میں ۳ فیصد اضافہ ہوا۔ کسٹمز انتظامیہ کی کارکردگی میں بہت بہتری آئی۔ غیر ٹیکس محصولات ۲۰۲۵ء میں ۱۶ فیصد بڑھے۔

۲۰۲۵ء میں حکومتی اخراجات صرف صفر اعشاریہ تین فیصد بڑھے۔ اس کے باوجود مراعاتی اخراجات (subsidies) میں ۴۳ فیصد اضافہ ہوا۔ یہ امدادی رقوم شہداء کے وارثین، جو لوگ زلزلوں سے متاثر ہوئے ہیں اور معذور افراد کو دی گئیں۔ سرکاری ملازمین کی پنشنوں میں بھی اضافہ کیا گیا اور حکومت نے اپنے سابقہ ادائیگیوں کے ضمن میں ایک ملین ادا کیے۔ حکومتی ترقیاتی اور دولت افزائی کے اخراجات میں ۵۲ فیصد کا اضافہ ہوا۔ مجموعی حکومتی اخراجات اور وصولیابیوں میں توازن قائم رہا۔ حکومت نے یہ سب بغیر کسی بیرونی یا اندرونی سول قرضے کے کیا۔ نہایت نامساعد حالات میں اسلامی حکومت اپنے مثالی عدالتی نظام کے قیام کے نتیجے میں کرپشن کو تقریباً یکسر ختم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے اور کرپشن کے خاتمے کے بدولت اس کو عوام کا اعتبار اور تعاون حاصل ہے۔

# امارت اسلامیہ افغانستان کی معیشت جنوری ۲۰۲۶ کے اعداد و شمار کے مطابق

یونس قادری

ورلڈ بینک کی جنوری ۲۰۲۶ کی رپورٹ کے مطابق، افغانستان کی معیشت عالمی تناؤ اور پاکستان کے ساتھ تجارتی و سیاسی کشیدگی کے باوجود غیر معمولی استحکام کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس وقت افغانستان کی معاشی شرح نمو ۴ فیصد ریکارڈ کی گئی ہے، جو کہ عالمی تناظر میں یورپ (۱ء۴ فیصد) اور چین (۵ء۴ فیصد) جیسی بڑی معیشتوں کے مقابلے میں کافی بہتر اور مستحکم ہے۔ سالانہ بنیادوں پر یہ ۷.۵ فیصد ریکارڈ کی گئی، خوراک میں ۵.۵ فیصد اور صحت کے شعبوں میں ۹.۱۱ فیصد قیمتوں میں اضافہ ہوا جبکہ دسمبر ۲۰۲۵ میں ماہانہ مہنگائی ۳ء۲ فیصد رہی، صحت کے شعبے میں قیمتیں ۸ء۸ فیصد تک بڑھ گئیں جس کی وجہ پاکستان کے ساتھ سرحدی بندش کے بعد درآمدی راستوں کی تبدیلی کے باعث ادویات کی خریداری کی لاگت میں اضافہ ہے۔ دوسری جانب ملبوسات کی قیمتوں میں ۸ء۱ فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا۔ خوراک کے علاوہ دیگر بیشتر اشیاء کی قیمتوں میں بھی تقریباً ۱ فیصد تک اضافہ ہوا، تاہم ٹرانسپورٹ کے کرایوں میں ۸ء۳ فیصد کمی نے اس اضافے کے اثرات کو کسی حد تک کم کر دیا۔ افغانی کرنسی (۲ء۶۶ افغانی فی ڈالر) نے اپنی قدر کو برقرار رکھا ہے۔

تجارتی شعبے میں صورتحال خاصی چیلنجنگ رہی۔ جنوری ۲۰۲۶ میں برآمدات تقریباً ۱۳۵ ملین ڈالر رہیں جبکہ درآمدات ۱ء۱ ارب ڈالر تک پہنچ گئیں جس کے نتیجے میں ماہانہ تجارتی خسارہ تقریباً ۹۵۰ ملین ڈالر رہا۔ مالی سال ۲۰۲۵ کے پہلے دس مہینوں میں مجموعی تجارتی خسارہ بڑھ کر ۹ء۴ ارب ڈالر (GDP کا ۴۳ فیصد) ہو گیا۔ برآمدات میں خوراک کا حصہ ۸۴ فیصد تک پہنچ گیا، جبکہ ٹیکسٹائل اور کوئلے جیسے شعبے کمزور رہے۔ برآمدی منڈیوں میں بھارت سب سے بڑا شراکت دار بن کر سامنے آیا (۴۴ فیصد) جبکہ پاکستان کا حصہ کم ہو کر ۲۵ فیصد رہ گیا۔ درآمدات کے حوالے سے ایران سب سے بڑا سپلائر رہا جس کا حصہ تقریباً ۷ء۳۰ فیصد ہے، جبکہ خام مال اور درمیانی اشیاء کی درآمدات (کل درآمدات کا تقریباً نصف) میں ۴۴ فیصد اضافہ ہوا، جو صنعتی سرگرمیوں کی بحالی کی نشاندہی کرتا ہے۔۔ امارت اسلامیہ افغانستان اب پاکستان کے بجائے ایران اور وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ نئے تجارتی راستے استوار کر کے معاشی تحفظ کو یقینی بنا رہی ہے۔

مالیاتی نظم و ضبط کے حوالے سے افغان حکومت نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

محصولات میں سالانہ بنیادوں پر ۶۳ فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے، جس سے مالی سال ۲۰۲۵ کے پہلے دس مہینوں میں مجموعی وصولی ۲۲۷٫۸ ارب افغانی تک پہنچ گئی ہے۔ سرحدی بندش کے نتیجے میں محصولات پر پڑنے والے دباؤ کے باوجود مجموعی کارکردگی مضبوط اور حوصلہ افزا رہی۔ مالی سال ۲۰۲۵ کے ابتدائی دس ماہ میں کسٹمز محصولات مجموعی طور پر ۱۵٫۲ فیصد بڑھ کر ۵۸٫۵ ارب افغانی تک پہنچ گئے جس نے مجموعی محصولات کی شرحِ نمو میں ۸٫۸ فیصد پوائنٹس کا حصہ ڈالا۔ یہ اضافہ اس میں بہتر ٹیکس نظام اور شفافیت کے ساتھ نظم و نسق پر مؤثر عمل درآمد اور متبادل راہداری راستوں کے ذریعے تجارتی بہاؤ کی کامیاب تنظیمِ نو نے اہم کردار ادا کیا۔ جس نے پاکستان کے ذریعے گزرنے والے ٹرانزٹ راستے میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کے اثرات کو بڑی حد تک زائل کر دیا۔

سماجی امداد پر اخراجات میں ۱۴۶٫۲ فیصد اضافہ ہوا، جبکہ اثاثہ جات کی خریداری میں سال بہ سال ۲۴٫۵ فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وسائل کا ایک مناسب حصہ سماجی امداد اور ترقیاتی اخراجات کی طرف مختص کیا جا رہا ہے۔ سماجی متنقلیوں کے اخراجات بڑھ کر ۱۸٫۳ ارب افغانی تک پہنچ گئے، اس اضافے کی بنیادی وجہ واپس آنے والے افراد کے لیے امداد میں توسیع، زلزلہ متاثرہ خاندانوں کی معاونت، شہداء کے اہل خانہ اور معذور افراد کی مالی مدد، اور ملازمین اور آجر کی پنشن ادائیگیوں کی تقسیم تھی۔ ترقیاتی اخراجات ۱۸٫۱ ارب افغانی تک پہنچ گئے جو مجموعی طور پر ۴۷٫۶ فیصد اضافہ ظاہر کرتے ہیں اور مجموعی اخراجات کی نمو میں ۳٫۷ فیصد پوائنٹس کا حصہ ڈالتے ہیں جو سرمائے کی تشکیل پر بڑھتے ہوئے زور کی نشاندہی کرتا ہے۔ حکومت نے یہ سب بغیر کسی بیرونی یا اندرونی سول قرضے کے کیا۔ افغانستان نے مالی سال ۲۰۲۵ کے پہلے دس ماہ میں ۲٫۸ ارب افغانی (جی ڈی پی کا ۰٫۲ فیصد) کا مالی سرپلس حاصل کیا، کیونکہ کل محصولات ۲۲۷٫۸ ارب افغانی، کل اخراجات ۲۲۵ ارب افغانی سے قدرے زیادہ رہے۔ یہ صورتحال مالی نظم وضبط اور معاشی استحکام کی طرف مسلسل عکاسی کرتی ہے۔

افغانستان کی معیشت کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا سودی قرضوں سے پاک ہونا ہے، جس کی وجہ سے بجٹ کا بڑا حصہ قرضوں کی ادائیگی کے بجائے عوامی فلاح و بہبود اور ترقیاتی منصوبوں پر خرچ ہو رہا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب دنیا کی بڑی معیشتیں سود کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں، افغانستان کی سادہ اور خود کفیل معاشی پالیسی نے اسے مالیاتی سرپلس فراہم کیا ہے، جو ملک کی پائیدار ترقی اور مستقبل کے معاشی استحکام کی طرف ایک مضبوط قدم ہے۔

# تبصرہ کتب: رسالہ قشیریہ

غلام جیلانی خان

کتاب کا نام: رسالہ قشیریہ (تصوف کی امہات الکتب)

تصنیف: حضرت امام بو علی قشیری علیہ الرحمۃ

ترجمہ و تعلیقات: ڈاکٹر پید محمد حسن (سابق صدر شعبہ ادب اردو جامعہ اسلامیہ بہاول پور)

ناشر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

ضخامت: ۱۱۳۳ صفحات

ملنے کا پتہ: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد

باسمہ تعالیٰ

"لاالہ حقیقت است، محمد رسول اللہ شریعت است" (بحوالہ کشف المحجوب)۔

"رہنمائی کرنا عقل کا کام ہے۔ اشارہ کرنا حکمت کا اور گواہی دینا معرفت کا (لا الہ الا اللہ)، چنانچہ عقل رہنمائی کرتی ہے، حکمت اشارہ کرتی ہے اور معرفت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ عبادات کی صفائی توحید کی صفائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ (بحوالہ "رسالہ قشیریہ")

رسالہ قشیریہ ایک ولی اللہ حضرت امام بو علی قشیری علیہ الرحمۃ کی تصنیف ہے۔ تصوف کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کی ضرورت و اہمیت بدیہی ہے۔ اسی لیے راہِ سلوک کے مسافروں کے لیے یہ کتاب ہمیشہ چراغِ راہ رہی ہے۔ نیز یہ کتاب ہر اس شخص کے لیے اہم ہے جو روحانی، مابعد الطبیعاتی حقائق، عرفان و مراتب میں دلچسپی رکھتا ہو۔ رسالہ قشیریہ تصوف کا حسن ہے جو اصطلاحاتِ تصوف، رموزِ تصوف اور طرائقِ تصوف اور تاریخِ تصوف کا ایسا مطالعہ ہے جو آپ کو نہ صرف عرفانِ ذات سے روشناس کراتی ہے بلکہ عارف باللہ ہونے کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ جیسا کہ آتا ہے "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" اپنے رب

کا عارف اور اپنے آپ کا عارف۔ کیونکہ تصوف کو سمجھنے کے لیے اپنے آپ کا عارف ہونا ضروری ہے۔

عاشق نہ شدی جلوۂ جاناں چہ شناسی
تا سر نہ دہی ہمت مرداں چہ شناسی

(شاہ صدیق سوداگر)

تو عاشق ہی نہیں ہوا، جاناں کے جلووں کو کیسے پہچانے گا (کیوں کہ) جب تک سر نہ دے گا، ہمتِ مرداں کو کیسے جانے گا۔

رسالہ قشیریہ تصوف کے صدر اول کی وہ کتاب ہے جو اپنے آغاز سے ہی قاری پر مسحور کن، کونیاتی اور روحانی جہات کے دروازے کھول دیتی ہے اور اپنے پڑھنے والے کو تصوف، شریعت، طریقت اور حقیقتِ جاودانی کی گہرائیوں کی سیر کراتی ہے جو کسی مبتدی اور سالک کے لیے حاصلِ زندگی ہوتی ہے۔ رسالہ قشیریہ رواں دواں سلاسل کی نظری، فکری اور عملی کرامات سے پروئی ہوئی ہے جس کا منبع اول حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور نبی آخر الزماں پر مکمل ہوتا ہے۔ امت کا ہر ولی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی خاص سیرت و نسبت کے چراغ سے روشن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت بو علی قشیری علیہ الرحمۃ بہت سے علوم میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ بیک وقت فقیہ، مفسر و محدث بھی تھے اور شیخ طریقت بھی اور عربی زبان کے اعلیٰ پائے کے شاعر بھی۔ آپ کے لیے آپکے ہم عصر کہتے تھے کہ اگر پتھر بھی سنے تو موم ہو جائے اور اگر شیطان کو ان کی مجلس میں باندھ دیا جائے تو تائب ہو جائے۔

اولیاء فرماتے ہیں نفس، قلب اور روح کے بیان میں اس سے زیادہ جامع اور دل نشین کتاب شاید اور کوئی نہیں۔

حضرت امام بو علی قشیری "الرسالہ قشیریہ" کے علاوہ مشہور کتابوں مثلاً تفسیر کبیر، آداب ترتیب السلوک الصوفیہ، لطائف والاشارات، کتاب الجواہر، کتاب الاربعین فی الحدیث

وغیرہ کے مصنف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ساٹھ کے قریب آپ کی تصانیف ہیں۔ اگرچہ ہر فن مولا تھے مگر تصوف آپ کا خاص فن تھا۔

حضرت بو علی قشیری علیہ الرحمۃ نے رسالہ قشیریہ، سبائیہ، باطنیہ، مانویہ، کرامیہ، صفاتیہ جیسے فرقوں کے رد میں اور صوفیاء کے اخلاص و مرتبہ کے بیان میں لکھا۔ حضرت امام ابن تیمیہ نے کہا کہ اگر تصوف کا مطالعہ کرنا ہو تو رسالہ قشیریہ کا مطالعہ کیا جائے۔ حضرت بو علی قشیری ایک گوشہ نشین زاہد و صوفی نہ تھے بلکہ آپ زندگی کے تمام علوم و فن سے آگاہ شخص تھے۔ بلکہ آپ بہترین شہ سوار، فن سپاہ گری کے ماہر تھے۔ آپ نے کئی مرتبہ باطن فرقوں و حکمرانوں کے خلاف عملی جہاد و خروج میں حصہ لیا لیکن حضرت کا خاص فن راہِ طریقت و تصوف تھا۔ فی زمانہ رسالہ قشیریہ نفس امارہ کی جدید بیماریوں لبرل ازم، سیکولرازم، نہلزم، سرمایہ پرستی کا شافی علاج ہے۔

رسالہ قشیریہ تصورِ کائنات کے ان مابعد الطبیعاتی اور حقائق اشیاء کا ادراک و فہم عطا کرتی ہے جس کی ہر زمانے کے مومن اور راہِ فقر پر گامزن ہونے والوں کو ضرورت رہتی ہے۔ اس کتاب میں اہل تصوف کی اصطلاحات مخاطرہ، مکاشفہ، مشاہدہ، لوائح طوالع، لوامع، تلوین و تمکین کی سادہ اور سہل تعریف کی گئی ہے جس کی جدید مادیت سے لبریز دنیا کو اشد ضرورت ہے۔ یہ کتاب قاری کو ایک نئے جہانِ معنی سے روشناس کراتی ہے۔ مسائل تصوف، صوفیا کے عقائد، مصادر و مبادیاتِ تصوف اور اصطلاحاتِ تصوف کو اکابر صوفیاء و اہل اللہ کی زبان میں کمال صراحت و بلاغت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ ان کے حالات و واقعات بیان کرتی بلکہ ان کی شخصیت اور ملفوظات کا بھی تعارف کراتی ہے جس کی ضرورت راہ سلوک کے مسافر کو ہر وقت رہتی ہے۔ رسالہ قشیریہ نہ صرف تصوف کی تاریخ بیان کرتا ہے بلکہ مشائخ طریقت اور ان کے اقوال و اخلاق کو بھی بیان کرتا ہے جو شریعت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ نیز اس رسالہ میں صوفیہ کی اصطلاحات کی تفسیر و تشریح بھی ملتی ہے مثلاً وقت، حال و مقام، انفس، تواجد، ارادت، شاہد و مشہود، صحو و سکر، محو و اثبات، تلوین اور تمکین وغیرہ۔ یہ تشریحات

روحانی رمز و اشارات سالک کو علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین کی منازل کا پتہ بتاتی ہیں اور ان منازل سلوک کو شریعت کے اندر رہتے ہوئے طے کرنا آسان بناتی ہیں۔

رسالہ قشیریہ ایک ایسا ریسرچ پیپر ہے جو تہذیبی و معاشرتی علائق و حقائق پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ امام قشیری کے زمانے کے سیاسی حالات سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اہل تصوف کبھی بھی ریاست و حکومت اسلامی کے معاملات سے علیحدہ نہیں رہے۔ امام قشیری، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی وغیرہم اپنے وقت کی سیاست و ریاست کے اہم عامل تھے۔ اہل تصوف ہمیشہ وقت کی سیاست و ریاست کو قلوبِ اسلامی سے قریب تر کرنے کے لیے اسلامی حزب کا کردار ادا کرتے رہے مثلاً! برصغیر پاک و ہند میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی سیرت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ خود امام قشیری پر حاکم وقت تادیب کرتے رہے، قید و بند، بے دخلی شہر کی صعوبتوں سے حضرت امام کو گزرنا پڑا۔ حضرات صوفیاء نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی سنت کو ہمیشہ اپنے شامل حال رکھا تاکہ ریاست کو شریعت اسلامیہ کا تابع رکھا جا سکے۔ دین، سیاست و ریاست کو باہم یکجا کر کے اسلام کے تفوق کو قائم کیا جائے۔ تصوف کے روایتی، علمی، فکری نظریات پر رسالہ قشیریہ میں جو مواد میسر ہے وہ کسی اور کتاب تصوف میں اہل اللہ کے تعلق کے ساتھ اتنی صراحت کے ساتھ نہیں ملے گا۔ تصوف کے روحانی ادب و رموز کو جاننے کے لیے یہ رسالہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی لیے اس کتاب (رسالہ) کو اہل تصوف نے امھات الکتب (عوارف المعارف، کشف المحجوب، قوت القلوب، نفحات الانس، کتاب اللمع، طبقات الصوفیہ) میں شمار کیا ہے۔

تصوف پر اعتراضات ہر دور میں وارد ہوتے رہے ہیں۔ آج بھی تصوف اور طریقہ ہائے تصوف پر طرح طرح کے اعتراض اٹھائے جاتے ہیں۔ ان اعتراضات میں بیشتر ناواقفیت، ظن و گمان پر مبنی ہوتے ہیں۔ بسا اوقات اعتراض کرنے والا تصوف کے امور و ادبِ آداب کی حقیقت کو جانے بغیر ایسے سوالات اٹھاتا ہے جس کا حقیقتِ احوال سے کوئی واسطہ نہیں

ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ کوئی جیسے ہندوانہ، راہبانہ طریقہ مسلمانوں میں رائج کر دیا گیا ہے۔ رسالہ قشیریہ میں ان اعتراضات کا کافی و شافی جواب مدلل دلائل کے ساتھ دیا گیا ہے۔ جس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تصوف قرآن و سنت اور تاریخ اسلامی سے ربط خاص رکھتا ہے اور ہم کو اس غلط فہمی سے نکالتا ہے جو تصوف کے متعلق وارد ہوتے ہیں۔ دراصل رسالہ قشیریہ لکھا ہی تصوف کے نظریات و عمل کی حقانیت اور باطل فرقوں مثلاً کرامیہ، باطیہ، سبائیہ وغیرہ کے رد میں تاکہ حق کو کفر و باطل سے علیحدہ کیا جا سکے۔

اس ضمن میں خود صوفیاء سے بڑھ کر شہادت کس کی ہو سکتی ہے۔ صوفیاء اپنے قول و فعل، طرائق، عادات نیز تحریر و تقریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دوسرے علوم کی طرح تصوف ایک علم ہے جو آپ کے جسم کے ساتھ روح و قلب سے بھی مخاطب ہوتا ہے۔ یہ جھاڑ پھونک، چھومنتر، تعویذ گنڈا نہیں ہے۔ تصوف اپنے علم و عمل کے ذریعے بھی سلاسل سے جوڑ کر قلوب پر ایک خاص قسم کی کیفیات مرتب کرتا ہے جو شخص ان کیفیات کا علم اور مشاہدہ نہ رکھتا ہو وہ تصوف کے علم و عمل کی اتھاہ گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا اور سر راہ ہی ٹھوکر کھاتا اور دشواریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ کتاب ہذا کے حواشی میں درج ہے کہ ایک فلسفی نے ابن عطا سے سوال کیا کہ تم صوفی لوگوں نے ایسے الفاظ گھڑ رکھے ہیں جن کے معانی لوگوں کو انوکھے معلوم ہوتے ہیں۔ تم نے مستعمل اور محتاط زبان ترک کر دی ہے یا تو تم ملمع سازی کرتے ہو یا اپنے مذہب و طریقے کے عیوب چھپاتے ہو۔ اس پر ابن عطا نے جواب دیا کہ ہم نے ان معانی کو انوکھے الفاظ اس لیے پہنائے ہیں کہ ہم کو غیرت آتی ہے کہ کہیں نااہل لوگ (یعنی فلاسفہ) انہیں جان نہ لیں اور یہ معانی نایاب چیز ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تصوف کی چاشنی اور روشنی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ ایک اور چیز مشاہدہ میں آئی ہے کہ جو تصوف کا انکاری ہے وہ فقہ اسلامی کا بھی انکاری ہے کیونکہ تصوف فقہ اسلامی کا عملی نمونہ فراہم کرتا ہے۔ خود امام بو علی قشیری بھی اپنے وقت کے ایک بڑے فقیہ و شارح تھے۔ رسالہ قشیریہ نیز اس کے مرتب کردہ ترجمہ و تعلیقات نے مذہب، دین، سنت کی وسیع تر

اصطلاحات، اصول و مبادی اور صوفیانہ اقوال کے ذریعے اس کو چار چاند لگا دیے ہیں جو نہ صرف تصوف کے ماننے والوں کے لیے مشعل راہ ہیں اور ان کے لیے خاص افادیت رکھتے ہیں، بلکہ اس میں ان بزرگوں کے لیے بھی عرفان و معانی کا بحر ذخار موجود ہے جو تصوف کے بارے میں عجب لیت و لعل میں مبتلا ہیں۔ ان کے لیے بھی بصیرت کے گوشے موجود ہیں کہ وہ حقیقت تک رسائی کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔

رسالہ قشیریہ ہر اس عنصر سے کلام کرتا ہے جو انسانی روح میں "قالوا بلیٰ" اللہ سے عہد و پیمان کی صورت میں موجود ہے۔ یعنی تصوف انسانوں کو وہ نشانیاں اور وہ راہ دکھاتا ہے جس سے وہ علم الٰہیہ کی روشنی میں اپنے ماحول اور وقت کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لیے صوفی طریقت و شریعت کی روشنی میں شریعت محمدیہ کے سرگرم مجاہد رہے ہیں۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ یہی اصل تصوف مجاہدین اسلام کے شانہ بشانہ ترکی سے ہندوستان، عرب سے افریقہ، برما سے فلپائن، انڈونیشیا و ملائشیا تک اسلام لانے اور پھیلانے کا موجب بنے رہے۔

رسالہ قشیریہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصولاً فی العمل تمام سلسلہ ہائے صوفیاء، اولیاء اللہ، تابعین و تبع تابعین سے ہوتے ہوئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے توسط سے اپنی اٹوٹ صورت میں فی ذاتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتے ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیاء اپنی جن باطنی اور روحانی کیفیات کا ذکر کرتے ہیں اور جن کا وہ اظہار کرتے ہیں وہ قرآن و سنت اور طریقہ صحابہ سے قریب تر ہیں۔ چنانچہ رسالہ قشیریہ میں اہل تصوف کے متعلق درج ہے کہ:

لَيْلِي بِوَجْهِكَ مُشْرِقٌ ... وَظَلَامُهُ بِالنَّاسِ سَارِي

فَالنَّاسُ فِي سَدَفِ الظَّلَامِ ... وَنَحْنُ فِي ضَوْءِ النَّهَارِ

ترجمہ: میری رات تمہارے چہرے کی بدولت روشن ہے حالانکہ اس کی ظلمت لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے چنانچہ لوگ تاریکی میں ہیں اور ہم دن کی روشنی میں۔

زمانے کی طویل تاریکی کے سبب حقیقی صوفی اور ان کے کمالات علم لدنی اب کہیں دکھائی

نہیں دیتے، ان تک رسائی کا طریقہ اب صرف ان کی تصانیف کے مطالعہ میں مضمر ہے اور ان تصانیف کی روشنی میں، ان کے ملفوظات میں، ان کے آداب و معنی کے ذریعہ، دین و دنیا کو باہم یک آمیز کیا جاسکتا ہے اور روحانی مراتب سے جسم و روح کو سیر اب کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات بھی عیاں ہے کہ کچھ مماثلت اہل صوفیاء اور دیگر ادیان کے فقیروں، سنت، گرو اور سادھوں اور رہبانیت وغیرہ میں نظر آئے گی لیکن ان سب مماثلتوں کے باوجود اسلامی صوفیانہ روحانی نظام بالکلیہ عیسوی اور ہندوانہ Mysticism اور باطنیت سے یکسر مختلف ہے یعنی تجسیم اور نیچریت وثنویت نہیں ہے۔ تصوف وحدہ لاشریک کی مدلل داستان ہے۔

صاحب رسالہ قشیریہ نے قدیم صوفیاء، جو سلسلہ ہائے تصوف کے مخزن ہیں، کے اقتباسات اسرار و معنی کے ضمن میں درج کیے ہیں۔ اصولاً یہ سب قرآن و حدیث کے ارشادات پر مشتمل ہیں جن کے ذریعے قرآن و سنت کے اہم موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً تصوف فی العمل آپ کو فقر کرنے پر راضی بہ رضا کرتا ہے کہ عملی طور پر فقر اختیاری فی نفسہٖ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں رسالہ قشیریہ کے "فقر" پر مبنی باب کا مطالعہ کرنا چیز دیگر است جو آپ کو اقلیم روحانی سے اقلیم ربانی تک لے جاتا ہے یعنی صوفیاء کے نزدیک فقر ایک روحانی بصیرت ہے جو انسان کو ہر شے کے اندر حقیقت مطلقہ کا مشاہدہ کراتی ہے۔

فقر بتاوے رازی نیارے
روپ سروپ ہیں اس کے سارے
فقر بتاوے سارے بھید
اس کی لاگی فقر کو دھو
کیا سادھو کیا سنت کیا شیخ
مٹ جائے دوجارہ جائے ایک

فقر یعنی فنا فی اللہ کا راستہ وہ راستہ ہے وہ دروازہ ہے جس کے ذریعے انسان وہ تمام پوشیدہ امر دریافت کرتا ہے جو مادی دنیا اور علمی عقل سے بالاتر ہوتا ہے جو سرمایہ کی محبت سے نکال کر

فقر کی عظیم الشان جاودانی دنیا کا گرویدہ بناتا ہے۔ قلب و نگاہ کو وسعت عطا کرتا ہے۔

الفقر فخری (الحدیث)

[ یہ قول بطور حدیث ثابت نہیں بلکہ بعض محدثین نے اسے روایت کے اعتبار سے موضع و باطل فرمایا ہے۔ لیکن اس کو فقرِ اختیاری کے معنوں میں لیا جائے تو فی نفسہ درست ہے ].

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

(اقبال۔ بال جبریل)

صوفیاء کہتے ہیں کہ فقر ایک بصیرت ہے جو انسان کو حقیقت انبیاء سے متعارف کراتی ہے۔ فقر وجود کی سطح کو چیر کر انسان کو حقیقت واحدہ تک لے جاتی ہے۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

(اقبال، ضربِ کلیم)

یعنی نگاہ فقر پر متمکن فرد اشیاء کو ان کی حقیقت میں پہچاننے والا بن جاتا ہے اور مومن کے مرتبۂ بلند پر فائز ہو جاتا ہے۔ صوفیا کے یہاں جو شخص اشیاء کی صورتوں سے آشنا ہو مگر حقیقت سے غافل ہو وہ کافر ہے۔ فقیر یعنی فقر اختیاری کو جو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیتا ہے اس کے لیے نہاں، عیاں ہو جاتا ہے اور غیب شہود ہو جاتا ہے جس کے ذریعے وہ اشیاء کی حقیقت کا شناسا ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں جب بادشاہ وقت نے گراں قدر تحائف بھیجے جس کو آپ نے لینے سے انکار کیا۔ جب بادشاہ بضد ہوا تو آپ نے ان اشیاء کو ہاتھ میں لے کر نچوڑا تو ان اشیاء سے خون بہنے لگا۔ آپ نے فرمایا عوام کا خون کر کے ان پر ظلم کر کے چیزوں کو لیتے ہو تم کو شرم نہیں آتی اور حرام مال ہماری خدمت میں دیتے ہو۔ فقر اللہ کے ولیوں کا شعار اور خواص کا زیور ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں مثلاً اتقیا اور انبیا کے لیے پسندیدہ قرار دیا ہے اور فقراء وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں

سے منتخب کر رکھا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم فرماتے ہیں ہم نے فقر مانگا تو مال نے ہمارا استقبال کیا لوگوں نے مال داری مانگی تو فقر نے ان کا استقبال کیا۔

ہر ہر میں بس ہر کو دیکھ

مٹ جائے دوجارہ جائے ایک

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا دنیا اور آخرت میں دونوں جہانوں میں فقیر کے لیے خوش خبری ہے، لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ دنیا میں بادشاہ (حکومت) اس سے خراج (ٹیکس) نہیں لیتا اور آخرت میں اللہ اس سے حساب نہیں لیتا۔

فقر کے باب کے علاوہ رسالہ قشیریہ کو کئی ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تصوف کا بنیادی اصول و مبادی یعنی تصوف کی تاریخ و ماخذ

۲۔ اکابر صوفیاء کا ذکر و احوال

۳۔ تصوف کے عرفانی عقائد و نظریات

۴۔ اعمال و اشغال تصوف

۵۔ تصوف کی اساسی عملی صورت حال وغیرہ

۶۔ صوفیاء کی اصطلاحات کی تفسیر

۷۔ ارادت و سلوک

۸۔ ولی کون

۹۔ صوفی اور غیر صوفی میں فرق

۱۰۔ شیخ کون

۱۱۔ تصوف اور آدابِ شریعت وغیرہ

خلاصۂ تبصرہ یہ ہے کہ رسالہ قشیریہ روزِ اول کے اہل تصوف کی داستان حیات و سیاسیات و معاشرت کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ یہ تصوف کے اصول و مبادی کا عرفی اور مستند بیان ہے جو قاری پر بہار بن کر طاری رہتا ہے۔ عرفان، ایقان و ایمان کی مخفی لذتوں سے بھی متعارف

کراتا ہے۔

بانگ قلم درین شب تار
بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار
(فیضی، بحوالہ شبلی، شعر العجم جلد چہارم، شاعری کی حقیقت وماہیت)

فاضل مترجم جناب ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب اور ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی یونیورسٹی کی کاوش یقیناً قابل تحسین ہے کہ تصوف کی امہات الکتب میں سے ایک اہم ترین کتاب رسالہ قشیریہ کا نہ صرف اعلیٰ و ارفع رواں ترجمہ کیا بلکہ اس کے حواشی اور اکابر صوفیاء کے حالات زندگی کو بزبان اردو منتقل کر کے کمال مستحسن کام کیا ہے جو عام قاری کے ساتھ ساتھ اہل تصوف کے لیے بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے نیز اردو زبان کی فکر کے ذخیرہ میں رسالہ قشیریہ کا ترجمہ و حواشی اردو ادب میں وقیع اور نایاب کام ہے۔ اور اردو دان طبقہ کو غیر فانی و آفاقی منازل کو سمجھنے کا راستہ بتاتی ہے۔ نیز رسالہ قشیریہ کا ترجمہ بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے تحت شائع ہونا خود امام بو علی قشیری علیہ الرحمۃ کی حالی و سلوکی کرامت ہے۔ اہل تصوف نے رسالہ قشیریہ کو گھر میں رکھنے کو موجب خیر و برکت قرار دیا ہے اور مشہور ہے کہ جس گھر میں رسالہ قشیریہ ہو گا وہاں کوئی آفت نازل نہ ہو گی۔

شدم باذات خود شید اصفاتم شد زمین پیدا
بہر شانے نمودارم بگردخویش می گردم

## آیاتِ شفا

ایک بار حضرت قشیری علیہ الرحمہ کا بیٹا سخت بیمار ہو گیا یہاں تک کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ حضرت قشیری علیہ الرحمۃ اپنے بیٹے کی بیماری سے انتہائی پریشان ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے حق سبحانہ کو خواب میں دیکھا اور بیٹے کی بیماری کا تذکرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قرآن مجید کی وہ تمام آیات جن میں شفا کا ذکر ہے جمع کر کے انہیں پڑھو اور اس پر پھونکو، پھر ایک برتن پر لکھو اور دھو کر اس کا پانی اسے پلاؤ"۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور بیٹا تندرست ہو

گیا۔ قرآن مجید کی آیاتِ شفایہ چھ آیتیں ہیں:

آیات الشفاء باذن اللہ تعالی

۱۔ویشف صدور قوم مؤمنین ۔(من سورۃ التوبۃ:۱۴)

۲۔وشفاء لما في الصدور (من سورۃ یونس:۵۷)

۳۔یخرج من بطونها شراب مختلف ألوانه فیه شفاء للناس(من سورۃ النحل:۶۹)

۴۔ونزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنین(من سورۃ الإسراء:۸۲)

۵۔وإذا مرضت فهو یشفین(من سورۃ الشعراء:۸۰)

۶۔قل هو للذین آمنوا هدی وشفاء(من سورۃ فصلت:۴۴)

أسأل الله العظیم رب العرش العظیم ان یشفي مرضاکم ومرضانا ، ویصلح حالکم وحالنا ویتولانا برحمته

چنانچہ بہت سے مشائخ کو دیکھا ہے کہ وہ ان آیات کو لکھ کر ان کا پانی مریض کو پلاتے تھے اور اللہ ان کو شفاعطا فرماتا ہے۔ وماتوفیقی الا باللہ۔

# Editorial: The Relationship and Tension between Revolutionary and Reformist Mobilisation

## What is a System?

Revolutionary and reformist mobilisation always occurs within a specific systemic context. A system is the unit that organises human relations within its sphere of operation in such a way that a particular conception of truth is realised, and a particular form of individuality, society, and state comes to dominate. For instance, capitalism is termed a 'system' because it possesses a specific conception of Truth: the promotion of freedom [i.e., the enslavement to one's *nafs al-ammarah*-(النفس الأمارة بالسوء) the tempting self]. Capitalism seeks the dominance of an individuality, society, and state that prioritise the pursuit of freedom.

As Shah Waliullah (may Allah have mercy on him) observed, Islam is also a system [1]. It possesses a specific conception of Truth: *Ibadah* (servitude to /worship of God). Islam organises individuality, society, and the state in such a way that the pursuit of Ibadah becomes dominant in every sphere of life. Since worship is the antithesis of freedom, an Islamic system cannot be established at all without transcending/overcoming the capitalist system.

## Revolution, Reform, and Systemic Transformation

Revolutionary struggle is of two types. Some revolutions are initiated to resolve certain contradictions within a specific system. For example, the British, French, and Russian revolutions were all capitalist revolutions; they were instigated to resolve certain systemic contradictions of the capitalist order. Conversely, Islamic revolutionaries seek to intensify capitalist contradictions. The purpose of an Islamic revolution is not the reform of the capitalist system, but its overthrow.

Similarly, reformist action is also of two types. The first kind is reform that compromises with the prevailing system and legitimises its operation through its discourse, attempting to resolve certain systemic contradictions through partial reform. Examples include: Islamic constitutionalism, Islamic banking, *Bano Qabil*, the inclusion of women in public life, reconciliation with the cultural hegemony of AI, and campaigns that portray Islam merely as a 'concept of life'. All these reformist efforts are attempts to resolve the contradictions of the capitalist system.

The second type of reform consists of efforts that remain connected to revolutionary struggle.

However, in Pakistan most reformist campaigns - and in the West many movements associated with the

great Sufi masters - largely ignore the capitalist system and instead seek space within its social order to promote servitude to and worship of God (*ʿubūdiyyah*) and the curtailment of freedom. The centre of these reformist movements is not freedom but the promotion of servitude to and worship of Allah (*Subḥānahu wa taʿālā*).

In Pakistan, their representative mass movements include the *Tablighi Jamaat* and *Dawat-e-Islami*.

A large proportion of sincere believers are affiliated with, or influenced by, such reformist movements. Whatever expression of Islam remains at the level of individual and social life owes much to the efforts of these reformist initiatives.

**The Islamic Revolutionary Era**

We are Islamic revolutionaries. We do not seek the reform of the capitalist system; we seek its destruction. In this sense, the revolution we wish to bring about is not a capitalist revolution. We are not merely seeking a change in the arrangement of the capitalist social order.

In our view, under the conditions of capitalist systemic dominance, the establishment of an Islamic government is an exercise in futility. It amounts to the capitalist state capturing the revolutionary party, and is one of the ways through which the systemic subjugation of capitalism is rendered impossible.

Similarly, we oppose every reformist initiative that resolves capitalist contradictions and thereby facilitates the expansion of freedom. In other words, all those secular reform campaigns that are devoid of *daʿwah* and that promote capitalist rights (human rights) and the rule of the law of capital are, in our view, various methods for the advancement of capitalism.

By contrast, we support and wish to strengthen all reformist efforts that are devoted to the promotion of Islamic values and that remain connected with the mission of *daʿwah*. We realise that we have been negligent in establishing contact with these *daʿwah*-oriented reformist movements.

خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف

(Forgive the shortcomings of your own kinsmen.)

Until the standard-bearers of reformist *daʿwah* are prepared to support Islamic revolutionary struggle, that struggle will remain alien to the great majority of sincere believers.

اے بھائی اگر تم ساتھ نہ دو تو ہم سے اکیلے کیا ہو گا

(O brother, if you do not stand with us, what can we accomplish alone?)

## Notes

[1] The following aspects of Shah Waliullah's thought are noteworthy here:

**1. Systemic Totality:**

For Shah Waliullah, the *Deen* (Islam as a totality) is not

merely a set of rituals but a complete "system of life". He states that when human society falls prey to corruption, simple individual reform is insufficient; rather, (*fakk kull niẓām* (dismantling the entire system) becomes necessary to establish a new, just order.

**2. Worship versus *Jāhiliyyah* (*nafs al-ammarah*):**

According to Shah Waliullah, the fundamental aim of Islam is the exaltation of the word of God (*iʿlāʾ kalimat Allāh*). This means that every sphere of human life - economy, politics, and society - must be subordinated to the worship of God. He describes this condition as fitrah (the natural order). In contrast, all systems founded upon human desire or coercive domination constitute forms of *jāhiliyyah* or corruption.

**3. Culture and Economy:**

Shah Waliullah connected economic corruption with spiritual corruption and regarded it as a major cause of systemic decay. One of his well-known observations may be summarised as follows:

When economic balance collapses within a state and people become preoccupied solely with luxury and the pursuit of permanence, they grow heedless of the worship of their Lord. Such a system resembles a cancer that must be cut out at the root.

**4. Conquest and Dominance:**

In Shah Waliullah's view, the predominance of a righteous order cannot be realised until it overcomes and subdues false systems. In his thought, the concepts of *jihād* and revolution signify precisely this: the triumph of truth cannot occur without the complete eradication of falsehood.

# Islamic Iran: The Defiance of a Powerless Heart

Javaid Akbar Ansari

Today marks the twelfth day of the war imposed upon Iran by Israeli-American terrorists. While it is not yet possible to make a definitive prediction regarding the ultimate outcome of the conflict, I will attempt to provide an analysis of the results observed thus far.

The first question is: why has this aggression been imposed upon Iran? The fundamental reason is the establishment and consolidation of an Islamic state in Iran, which imperialism is not prepared to tolerate under any circumstances. This Islamic state is the greatest obstacle in the path of Israel's regional expansion. For this very reason, from the very first day, imperialism announced the goal of its eradication, and for the past 46 years, it has been consistently preparing to achieve this objective.

From this it becomes clear that wherever and whenever an Islamic state comes into existence, imperialism will sooner or later launch an attack upon it. By contrast, non-Islamic Muslim states (Pakistan, Turkey, Egypt) can be turned into subordinate clients and absorbed into the imperial capitalist order. But the existence and stability of Islamic states represent the greatest, most enduring and most fundamental threat to imperialism.

یہ کھٹکتی ہے دلِ کافر میں کانٹے کی طرح

(It rankles in the kāfir's heart like a thorn.)

Imperialism can tolerate reformist and Dawah oriented Islamic approaches, and it has a long history of making compromises with reformers. However, once reformers acquire the power of the state, such compromises can no longer be sustained.

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحر قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

(Modern intellect has again cast the ancient spell; to traverse this era successfully is not possible without the staff of Moses.)

تو را است معجزہ در کف، ز ساحران مہراس
عصا بیفکن و از بیم اژدھا مگریز

(A miracle is held within thy palm—fear not the sorcerers; Cast down thy staff, and flee not from the dragon's dread.)

The staff of *Kalimullah* (Moses) is the very means by which imperialism can be dismantled. For this reason, Imam Khomeini (may Allah have mercy upon him) used to say that he bequeaths to the people the task of bringing about revolution as soon as possible. Unfortunately, the overwhelming majority of the Muslim Ummah does not accept this counsel and looks with suspicion upon attempts to integrate reformist and revolutionary struggles.

This constitutes uncontrovertible proof that, in the

present age, the struggle for establishing an Islamic state takes precedence within the broader struggle for the establishment of Deen (Islam in its totality).

The second lesson we learn from the Iranian struggle is that Islamic revolutions can only be brought about by revolutionary scholars—those scholars who possess the ability to:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

(Come out of the khānqāhs and uphold the example of Shabbir)

Because:

خلافت بالیقیں انہی کو ملنی چاہیے پہلے
امیرالمومنین ان میں سے چن کر لائے پہلے

(Undoubtedly, leadership should belong above all to them. Historically, it was from their ranks that the Commander of the Faithful arose.)

Over the past forty-six years, Iranian scholars have fully demonstrated their organisational and technical capacities. They have given extraordinary importance to military capability in order to maintain internal security. For this reason, it has become almost impossible for American, Israeli, or Gulf ground forces to enter Iran. They have established a robust surveillance system, and most Zionist attacks are proving unsuccessful. Their missile programme has also proven highly effective. Above all, despite the war, attempts to disrupt the country's supply of food

and essential goods have failed completely.

Furthermore, the greatest achievement of these scholars is that they have kept the public united behind them, despite extremely unfavourable circumstances. Imperialism expected that in response to its attacks, the public would revolt, but this hope proved entirely futile. So much so that even pro-democracy circles no longer demand the downfall of the Islamic government, and nearly every day, the public comes out onto the streets in major cities in support of the government. This is why, unlike Latin American countries such as Venezuela and Mexico, Iran has kept its nuclear programme secure while holding its head high, rather than bowing before American and Israeli demands.

This is the fundamental difference between a socialist and an Islamic revolution: socialist revolutions fuel the desires of the masses, whereas an Islamic revolution prepares the masses to make sacrifices.

We hope that Iran will win this war and emerge as a stable Islamic state. However, even if the Mujahideen lose this war, it will only be a temporary setback; and until imperialism is completely defeated, we will continue to fight this war - in Egypt, in Türkiye, in Yemen, in Nigeria - and everywhere else.

# Islamic Revolutionary Struggles

# Trump's Gaza Peace Plan and the Silence of Islamic Parties

Javed Akbar Ansari

The real objective of Trump's peace plan is to transform Israel's military defeat into a victory for imperialism. Despite its military superiority and full backing from the United States, Israel has, since the war that began in 2023, failed both to secure the release of its captives and to bring the entirety of Gaza under its control. Even today, more than eighty-five per cent of Gaza remains under the authority of Hamas and other Islamic Jihadi organisations.

Since neither Israel nor America possesses the power to compel Hamas to surrender, they have orchestrated the charade of negotiations to achieve this end. Should this peace plan be successfully implemented, Hamas would not only lay down its arms, but Israeli hegemony over the whole of Gaza would be consolidated, allowing imperialism to establish comprehensive control over its social and economic life.

Despite the proclamation of this plan, the Israeli invasion of Gaza persists; by January 2026, the number of Muslim martyrs, according to the Israeli military's own accounts, has exceeded 74,000. Regarding this peace treaty, the Urdu verse aptly captures the hypocrisy:

وہی قتل بھی کریں ہیں، وہی لیں ثواب الٹا

(Wohi qatl bhi karein hain, wohi lein sawab ulta)

They commit the killing, and then claim the merit besides.

The purpose of the peace treaty is the total liquidation of resistance against Israel within Gaza; this is the primary condition for establishing "peace." Should Israel's decisions be challenged in any form - be it military, democratic, or through resistance - Israel reserves the right to initiate terrorist actions. The schemes envisioned for the reconstruction and development of Gaza are, in reality, blueprints for imperialist subjugation. The core developmental concept is to transform the Gaza Strip into a pleasure-ground for American, European, and Israeli indulgence, where obscenity and vulgarity may flourish and the traditional Islamic lifeworld of Gaza may be torn asunder.

Several pro-imperialist countries in the Muslim world are accomplices in this shameful project, including Pakistan, Egypt, Turkey, Saudi Arabia, the United Arab Emirates, and Indonesia. These include Muslim states that are already allies of Israel - namely the UAE, Bahrain, and Morocco - as well as those that have not yet formally become allies, such as Turkey, Pakistan, and Saudi Arabia.

However, all participants in this plan are required

to recognise the existence of Israel. Israel is itself a member of this peace treaty, and since the treaty's aim is the protection and expansion of Israel, all participants are forced to accept Israel's regional supremacy and the hegemony of US imperialism. Trump has repeatedly stated that this is the first step toward the incorporation of all participants into the Abraham Accords, and in this regard, the greatest pressure will be exerted upon Saudi Arabia, Turkey, and Pakistan.

The robust public resistance that should have met this plan is conspicuously absent. In Pakistan, we expected Jamaat-e-Islami to organise public resistance, as its Amir had repeatedly opposed Hamas's surrender and sought to mobilise public sentiment in favour of the Palestinian cause. While Jamaat-e-Islami consistently engages in public resistance for local government and civil rights, it appears to be withdrawing from the support of the Ummah's greatest cause: the Palestinian Jihad. Mobilising public opinion on this issue would not be particularly difficult. It increasingly appears that the party has come under the influence of the establishment in this matter. Not only has it failed to organise mass resistance, it has not even articulated a clear verbal opposition to the peace agreement, unlike leaders from *Jamiat Ulema-e-Islam* and *Majlis -Wahdat-ul-Muslimeen.*

In those Muslim countries where the liberal-democratic process continues - Pakistan, Turkey, Indonesia, etc., it is the primary duty of the Islamic parties to awaken public movement in support of Hamas and demand a withdrawal from this peace treaty. Failure to fulfil this duty risks gravely undermining their Islamic identity, and would justify the charge that, at a critical historical moment, they have refrained from confronting imperial power.

# Jamaat-e-Islami's Success in Bangladesh: Expectations and Risks

Javed Akbar Ansari

In the 2026 elections, Jamaat-e-Islami Bangladesh achieved a significant victory. It received approximately 9.5 per cent of the votes cast, which amounts to about 7.5 per cent of the total electorate. However, it secured 68 seats in the assembly, which constitutes roughly 23 per cent of the total seats. The alliance formed by Jamaat-e-Islami won 77 seats in total.

This is the largest electoral success of Jamaat-e-Islami since the fall of East Pakistan. Today, Jamaat-e-Islami Bangladesh has emerged as an important political force. This success bears some resemblance to the victory of the Al-Ikhwan al-Muslimun in Egypt in 2012. Like the Ikhwan, Jamaat-e-Islami has made unparalleled sacrifices over the past half century and has endured imprisonment, repression, and violence. Under extremely adverse circumstances, its workers demonstrated remarkable steadfastness. They remained firm and did not sell themselves to the enemy. Their sustained sacrifices will, God willing, serve as a guiding light for Islamic activists everywhere.

However, the experiences of the Al-Ikhwan al-Muslimun during 2012–2013 were not encouraging.

Egypt's pro-democracy movement included many secular nationalists, and the same was true for the 2023 resistance movement in Bangladesh. In both movements, the Islamic character was not dominant; rather, both demanded the establishment of "capitalist justice."

During its tenure, the Al-Ikhwan al-Muslimun opted for a path of reconciliation with secular forces and their military patrons, failing to implement Islamic injunctions that could have weakened those secular elements. It neither established an effective framework for the implementation of the Sharia, nor severed its links with imperial institutions, nor practically withdrew from cooperation with Israel.

In 2013, Imam Morsi (may Allah have mercy on him) was martyred, and the Ikhwan government was dismantled. This failed experiment teaches us that attempts to appease secular forces yield nothing. Jamaat-e-Islami previously participated in Khaleda Zia's government, yet we gained no benefit from it. Even today, we should harbour no expectations from the BNP. Their past policies clearly indicate that they will establish a purely capitalist government subservient to imperial interests. Jamaat-e-Islami should instead present itself as a strong opposition with a distinct Islamic agenda.

Jamaat-e-Islami Bangladesh is the heir to the Islamic

revolutionary movement of Mawlana Mawdudi. Our revolution must ultimately lead to the dismantling of the capitalist system. The central theme of our election campaign was the demand to eliminate corruption. Now we must demonstrate that the spread of corruption is a natural and inevitable consequence of the institutional order of capitalism, and that no capitalist country can eradicate corruption.

In order to limit the powers of capitalist institutions, it is necessary for Islamic morality and spirituality to flourish within society. To fulfil this responsibility, a comprehensive programme of education and training for young people should be organised in cooperation with other Islamic groups.

In this regard, the following measures are necessary:

- The promotion of halal livelihoods. For this purpose, a financial system based on partnership (*musharakah*) and profit-sharing (*mudarabah*) should be established. The aim of this system should be to empower sincere believers (*mukhleseen-e-deen*) at the social level.

Every mosque should assume responsibility for providing the following services within its locality:

- To assume responsibility for organising the justice system at the neighbourhood and bazaar level.
- Establishing and regulating price controls,

service fees, and rental rates at the neighbourhood and bazaar level.

- Promoting schemes for halal livelihoods and fostering businesses free from interest and speculation.
- Preventing obscenity and immoral practices (*munkarat*) at the neighbourhood and bazaar level.
- Organising programmes of Islamic education, training, and spiritual purification, especially for the youth.
- Monitoring the provision of electricity, gas, and water services at the neighbourhood and bazaar level.

The purpose of this operational system is to establish a state within a state, in which authority and executive power gradually shift from capitalist state institutions into the hands of sincere believers.

This system should be backed by the members elected through the party. It will be their responsibility to struggle for the protection and expansion of this framework.

Bangladesh does not lack sincere believers. These are individuals who observe Islamic practices in their personal lives and maintain an emotional attachment to Islamic symbols. The problem is that such sincere believers are socially weak and powerless. A central objective of Jamaat-e-Islami's strategy should therefore be to remove this deprivation and helplessness.

As a result of these efforts, Jamaat-e-Islami will emerge as a stable social force, and the social foundations of its political activity will become firmly established, God willing.

In order to make this strategy successful, it is essential for Jamaat-e-Islami to work alongside as many Islamic groups and organisations as possible - both political and reformist. Jamaat-e-Islami Bangladesh should play the role of a connecting organisation that fosters coordination among Islamic movements and groups.

# The Pak-Afghan Conflict – A Tragic Incident

Javed Akbar Ansari

## The Nature of the Incident

Relations between Pakistan and Afghanistan had been deteriorating since 2021, but they escalated into an open state of conflict in October 2025. Pakistan launched limited strikes inside Afghan territory, and border skirmishes ensued, resulting in casualties among soldiers on both sides. Roughly two months prior to these attacks, Donald Trump had expressed his intention to reclaim the airbase lost in Afghanistan, stating that if the base was not returned, "something or the other" would happen. This sequence of events suggests that imperialist forces have an interest in fanning the flames of tension between Pakistan and Afghanistan.

Pakistan has complained of militant attacks in its border regions originating from Afghan territory, asserting that the Afghan government has done little to prevent them. It has also alleged that Afghanistan is playing into India's hands. In a recent statement, the head of India's intelligence agency, Research and Analysis Wing (RAW), indicated that India would seek to promote relations with the Taliban through Deobandi scholars.

Pakistan's largest political party and a key opposition force, Pakistan Tehreek-e-Insaf, has

supported the government's position, stating that in the event of war it would stand by the Pakistani authorities, just as it had during previous wars with India.

However, Pakistan's Islamic parties do not view the conflict through the same lens. They have adopted a neutral stance and have called for an end to the friction. Maulana Fazlur Rehman has attempted to mediate between Pakistan and the Taliban, while the Islamic Republic of Iran has also offered its assistance in reconciliation.

By the grace of God (*Alhamdulillah*), a peace agreement was reached on 24 October through the efforts of Turkey and Qatar. To ensure the durability of this peace, Pakistan and Afghanistan have indicated the formation of a joint committee. Most encouragingly, despite Donald Trump's intense desire, imperialist forces played no role in this reconciliation. It is prayed that this peace agreement proves lasting, and that American imperialist and Indian efforts do not succeed in undermining it.

**Afghanistan's Responsibilities**

To ensure that this agreement proves long-lasting, both countries bear responsibilities. Immediately after regaining power in September 2021, Afghanistan announced that it would not allow its soil to be used for military operations against any other country. This

was an extremely prudent decision, to which the Taliban government remains committed in principle.

The reality is that Afghanistan is a small Islamic country resisting the onslaught of imperialism, which has exerted maximum effort to engineer its political isolation and undermine its economic and social stability. Despite this pressure, the Taliban government has established a degree of peace and social order across the country through the provision of exemplary justice. The economy shows signs of development, and the Islamic government enjoy the trust and support of the population.

It is the government's responsibility to safeguard these achievements, attained within a short span of three years. Under such circumstances, initiating war could prove detrimental to economic and social stability. Many major nations have grown wary of the systemic hegemony of the United States; thus, cultivating strategic relations with Russia, China, and Iran presents itself as a geopolitical necessity for Afghanistan. Similarly, fostering cooperation with Turkey and Pakistan remains equally important. In this context, military adventurism cannot yield beneficial results.

Furthermore, militant movements active in Pakistan, Uzbekistan, Tajikistan, and East Turkestan may persist for a long time, yet they are unlikely to

produce a qualitative transformation in the social order or state structure. At most, they risk creating openings for American imperialist and Indian intervention in Muslim countries. These movements lack an underlying revolutionary process capable - at an institutional level - of disabling the existing establishment and transforming the masses into active supporters of the struggle for the establishment of the Deen (*Ghalba-e-Deen*).

**Pakistan's Responsibilities**

Promoting peace and stability with Afghanistan is also a necessity for Pakistan. This need is simultaneously defensive, strategic, economic, and social in nature. Pakistan, too, remains a target of imperialist pressure. In October, the United States signed a ten-year defensive pact with India to enhance cooperation in information sharing and military technology. Pakistan lies within India's military crosshairs, and this agreement is likely to augment India's military capacity. Under such circumstances, opening an additional front along Pakistan's western border would be strategically unwise.

Pakistan should instead move toward a defensive pact with Afghanistan. For this to materialise, it is essential that Pakistan formally recognise the Afghan government. The recent peace agreement ought to be transformed into a long-term defense treaty [1].

Pakistan traditionally accounts for a significant share of Afghanistan's annual exports. At present, however, these exports remain halted, and all formal channels for remittances have been suspended. The Port of Karachi has been closed to Afghan transit trade. While this suspension will undoubtedly harm the Afghan economy, the economic damage to Khyber Pakhtunkhwa - particularly the former Federally Administered Tribal Areas (FATA) - may prove even more severe.

Such disruption risks undermining the province's economic stability, where populations maintain deep social and commercial ties with Afghanistan and perceive the trade ban as an assault on their livelihoods. Afghanistan will, sooner or later, need to circumvent these trade restrictions. It has recently secured transit facilities at the Port of Bandar Abbas in Islamic Republic of Iran; however, Pakistan's border regions may lose access to the Afghan market for an extended period.

Ending trade ban, therefore, is an economic necessity for Pakistan. Continued restrictions are likely to benefit Indian industries, which could move to dominate the Afghan market. Iran, too, stands to gain; in 2025, it reportedly supplied 33% of Afghanistan's imports.

**Notes:**

[1] The skirmishes of May 2025 and the subsequent U.S.-India Defence Pact of October 2025 have fundamentally altered the regional security calculus. The active assistance provided by Israel to India during the May conflict, coupled with the ten-year American strategic commitment, suggests a concerted effort to utilise India as a regional proxy. This alignment is particularly potent if Pakistan demonstrates a diplomatic or strategic inclination towards Iran, especially given Pakistan's status as a nuclear-armed state. The vulnerability of Pakistan's airbases- stretching from Noor Khan to Sindh - was laid bare by Indian strikes in May 2025. Given Pakistan's narrow geographical width, its strategic assets remain perpetually within the enemy's range of fire. Consequently, the pursuit of Strategic Depth is no longer a theoretical preference but a survivalist necessity. To mitigate this, Pakistan must formalise a tripartite strategic alignment with Afghanistan and Iran. In the event of a high-intensity conflict, the ability to relocate fighter aircraft and critical assets to Afghan territory would provide the necessary sanctuary to preserve a second-strike capability. This requires transitioning from a policy of border management to one of a formalised Mutual Defence Treaty with the Afghan government [Kashif Ali].

# Israel's Imperial Strategy

Javed Akbar Ansari; Ali Muhammad Rizvi

The territories occupied by imperial powers fall into two categories. In some regions, imperial states established control by carrying out the mass extermination of the native population and settling their own people there. Such cases include the United States, Canada, New Zealand and Australia. It is appropriate to describe these as settler colonies. In other regions, however, imperial powers - such as Britain, France, and the Netherlands - were unable to annihilate the indigenous populations; examples include India, Indonesia, and South Africa. These are not settler colonies but colonies.

History shows that in settler colonies imperialism has pursued a strategy of territorial expansion and the displacement of the remaining indigenous population. In colonies, by contrast, imperialism relies on the economic and social exploitation of the local population. This exploitation continues even after formal independence, at which point the colony is transformed into a neo-colony, over which imperial domination persists.

Israel is a settler colony; it is neither a colony nor a neo-colony [1]. Like the United States, Israel is a militant state and economic system that has placed regional expansionism at the very heart of its policy.

From its inception to the present day, Israel's primary objective has been the mass killing of Muslims and their territorial displacement, for without this the Zionist dream of "Greater Israel" cannot be realised [2]. Thus far, in Gaza alone, Israel has martyred seventy thousand Muslims - merely two per cent of the three million whose extermination and displacement it envisages [3]. Neither the Oslo Accords nor the Abraham Accords will be allowed to stand in the way of the slaughter of these three million souls [4].

Since the mid-nineteenth century, Zionism has been in conflict with Muslims. Prior to the establishment of the Israeli state, it periodically received support from British imperialism. Following the formation of the World Zionist Organization, funds were raised from the global Jewish community for Israel, and political opinion was mobilised in favour of statehood. After the First World War, large-scale Jewish migration from Europe to Palestine began, accompanied by the seizure of Palestinian land and the displacement of Muslims. From the outset, Jewish settlers adopted a policy of replacing Muslim working masses, while imposing restrictions on their movement and communication. Jewish trade union organisations played a decisive role both in the displacement of Muslim workers and in the formation of the Israeli state system [5].

From 1936 to 1939, Muslims carried out a sustained

series of resistance efforts against Jewish settlers, which British imperialism, in collaboration with those settlers, brutally suppressed [6].

Shortly after its establishment, the United Nations recognised Israel and approved the partition of Palestine. At that time, Jews constituted 38 per cent of the population, yet 55 per cent of the land was allocated to them. Subsequently, Israeli forces seized control of 77 per cent of the territory. Through the Nakba, approximately one million Muslims - around 65 per cent of the Palestinian population - were expelled from their homeland [7]. Following the 1973 war, Israel occupied the West Bank and East Jerusalem. After the Oslo Accords, a proxy government of the PLO was installed in the West Bank, functioning as an instrument for implementing Israeli policies and administering the territory [8]. Since then, Israel has repeatedly expressed its intention to extend its control over southern Lebanon, Syria, and Jordan. In advancing this aggression, Israel's principal ally has been the United States, which provided it with three trillion dollars in aid between 1947 and 2025, including eighteen billion dollars' worth of military supplies in the most recent war. Today, Israel's military-industrial sector has effectively become part of the American war economy [9]. The United States supports Israel in part because it too, from its founding until the late

nineteenth century, carried out the mass killing of millions of Indigenous people.

In the current war (2022–2025), despite setbacks in Gaza, Israel has consolidated control over southern Lebanon, launched attacks on Iran, entered Syria, and played a key role in the removal of Assad. It has also displaced approximately one hundred thousand Muslims from the West Bank and authorised more than thirty new Jewish settlements [10].

Israel is distinctive as an imperial entity in that it seeks to reduce its dependence on its patron, the United States. Although it receives approximately five billion dollars annually in American aid, it has developed a defence industry valued at three trillion dollars. The Israeli state is a military economy [11]. It is the Israeli army (IDF) that has forged European, African, Arab, and Russian Jews into a single Israeli identity [12]. The Israeli military has rendered Palestinian Muslims powerless and seeks to impose similar conditions upon Muslims in Syria, Lebanon, Egypt, and Iran. It aims at the fragmentation of Muslim states in the region and their transformation into subordinate entities.

Politically, Israel is a sovereign state [13] that continually seeks to compel its patron - the United States - to accommodate its strategic ambitions. To this end, it has mobilised a powerful lobbying apparatus

(AIPAC), which, while not wholly dominant over American politics and economics, possesses significant influence and has thus far operated effectively. Jewish lobbying groups in the United States, along with allied organisations, maintain sustained engagement with the presidency, legislature, media, and think tanks. They have succeeded in persuading many Americans that opposition to Israel may be equated with support for the Holocaust. American corporations have invested heavily in Israeli industry, and the American and Israeli IT sectors have become deeply integrated [14].

During the presidencies of Trump and Biden, Israel's influence over American policy in Central Asia has increased. Nevertheless, divergence between American and Israeli national interests is also growing. Maintaining Egypt under military dictatorship does not serve long-term American interests, yet the advent of democracy in Egypt would likely strengthen support for the Palestinians. This lesson was demonstrated by the removal of the Muslim Brotherhood government in 2013. Similarly, Iran's acquisition of nuclear weapons may ultimately be tolerable for the United States, since the failed American–Israeli attacks of 2025 have shown that the Islamic Republic of Iran cannot be eliminated. Iranian nuclearisation may establish a regional balance of

power analogous to that in the Indo-Pak subcontinent.

Many American policymakers now argue that Iranian nuclear weapons pose no direct threat to the United States, and that continued engagement in the Middle East diverts attention from more pressing theatres, particularly China. Trump's recent strategic planning has emphasised maintaining dominance in Latin America, including preparations for intervention in Venezuela and Colombia, as well as ambitions regarding Greenland. Under such conditions, if the United States becomes convinced that it cannot win in the Middle East - as in Vietnam or Afghanistan - it may be compelled to withdraw, which would entail abandoning support for Israel. Without American military and diplomatic backing, Israel cannot sustain its expansionist project.

According to a Pew Research survey conducted in April 2025, 53 per cent of Americans oppose Israel, and even American Jews have criticised its policies, arguing that the prolonged war in Gaza is being continued primarily to keep Netanyahu out of prison. Another survey (June 2025) suggests that Netanyahu is likely to lose the national elections in October 2026.

Nevertheless, the same survey indicates that 70 per cent of Israelis support the continuation of operations in Gaza. At the same time, an Israeli general has reported growing demoralisation and psychological

distress within the army in Gaza, Lebanon, and Syria, with cases of desertion and disciplinary action for insubordination.

Despite all this, the influence of the Israeli lobby in the United States has not diminished. American military and economic aid continues, and intelligence cooperation between Mossad and the CIA has advanced through multiple stages of integration, playing a crucial role in Israeli operations in Iran and Syria. For the present, the United States continues to offer full support for Israel's expansionist policies [15].

This expansionist strategy is not merely about enlarging Israel's borders, but about fostering a system of dependent statelets across the region. Its principal elements are as follows:

1. The gradual depopulation of the West Bank of Muslims and the settlement of Jews in their place.
2. The division of Syria into four statelets: two Sunni, one Alawite, and one Druze.
3. The division of Iraq into three statelets centred on Baghdad, Mosul, and Basra.
4. The division of Egypt into two entities, with the southern region assigned to Coptic Christians.
5. The separation of Arab-majority regions from Iran and the continuation of efforts to overthrow its Islamic government.

These statelets would remain in conflict with one

another and be governed by regimes subordinate to Israel. Formally independent and outwardly democratic, they would in practice function as constituent parts of an Israeli empire, much like Britain, Gaul, and Greece within the ancient Roman Empire.

To defeat this strategy, effective intervention cannot be expected from Arab governments, all of which are inclined towards accommodation with Israel and will, sooner or later, be prepared to pay any price for such accommodation. This responsibility must therefore be assumed by Hamas and Hezbollah, which should strive to establish Islamic governments in Lebanon, Syria, and Jordan, thereby opening a land route for an Iranian ground offensive against Israel. Israel's aerial superiority can only be countered through ground warfare, where its weaknesses have already been exposed in Gaza.

The second objective is to foment civil war within Israel. Suicide attacks have begun in Tel Aviv and the West Bank, prompting the Israeli legislature to enact stricter security laws, while approximately one thousand European Jews have emigrated from Israel. A successful Iranian ground offensive would require such internal conflict to reach its peak.

The third objective is to compel the United States to withdraw from the Middle East. This responsibility

rests upon Islamic movements and organisations worldwide. The proposed international "peace force" in Gaza under Trump's plan must be strongly opposed by Muslim countries. Campaigns to boycott American products and investment - thus far largely ineffective - must be incorporated into national political agendas so as to impose an intolerable cost on the United States for its support of Israel and its interventions in the Muslim world. Muslims in America must organise and mobilise to counter the influence of the Israeli lobby and collaborate with groups already active in this effort.

This is a long-term struggle. It must be pursued with the firm resolve that the existence of the Israeli state will not be accepted under any circumstances or conditions. Sooner or later, an Islamic state will be established in Palestine -God willing.

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

(Recreate the atmosphere of Badr; for your aid, even now the angels from the heavens can descend, rank upon rank.)

## Notes and References

[1] Israel's strategy contains elements of both; though it ultimately intends to transform the West Bank and Gaza into full settler colonies, it currently operates like a traditional colony there by occupying land and using Palestinians as cheap labour. Internally, it is a settler state where the indigenous population has been reduced to a

minority.

[2] In Zionist thought, the concept of Eretz Yisrael (the Land of Israel) is not merely religious but constitutes a project of geographical and political expansionism.

- Strategic depth: Israel's militarised economic system (military-industrial complex) is premised on continuous warfare and occupation. This economy is sustained by arms sales and "battle-tested" technologies.
- Policy of displacement: From 1948 to the present situation in Gaza, every military operation has had, alongside its immediate objectives, a clear underlying aim: to push Palestinians into neighbouring countries (Egypt or Jordan), thereby "cleansing" the land of its indigenous population.

[3] The reference in the text to casualties in Gaza and future intentions is described by some scholars of international law as incremental genocide. While official casualty figures are already staggering, the systematic destruction of infrastructure - hospitals, universities, and bakeries - indicates that the objective is not merely military victory but rendering the territory uninhabitable so that the remaining population is compelled to migrate. As suggested in the text, within the vision of "Greater Israel," the presence of Palestinians is viewed as a demographic threat, the elimination of which is considered necessary for the state's survival.

[4] The claim that the Oslo Accords and the Abraham Accords would not obstruct this process appears to be borne out historically. The Oslo Accords provided Israel with the façade of a "peace process," while, in practice, the number of settlements in the West Bank increased threefold. The Abraham Accords sought to detach the Palestinian question from regional politics and normalise Israel's position within the Arab world, thereby enabling it to advance towards a "final solution" to the Palestinian

question without facing diplomatic isolation.

[5] The organisation Histadrut promoted the slogan of "Jewish labour only." The aim of this policy was to economically cripple Palestinian Arabs by removing them from Jewish-owned factories and farms and replacing them with newly arrived Jewish settlers. Histadrut was not merely a trade union; even before the establishment of Israel, it had founded hospitals, schools, and banks, which later became part of the institutional framework of the Israeli state.

[6] This period marked a decisive turning point in the history of Palestinian resistance. Palestinians carried out a six-month general strike, one of the longest anti-colonial strikes of its time. Britain suppressed the uprising through aerial bombardment and collective punishment. Zionist militias (such as the Haganah) played a significant role in this repression. The British trained settler forces and formed "Special Night Squads," which conducted raids on Palestinian villages. These trained units later became the foundation of the Israeli army (IDF) in 1948.

[7] The Nakba constituted a systematic process of ethnic cleansing. Under "Plan Dalet," Israeli forces (including the Haganah and Irgun) deliberately carried out mass killings to instil fear among the Palestinian population and force their displacement.

[8] The Palestinian Authority (PA), established after the 1993 Oslo Accords, effectively functions as a security apparatus for Israel. It suppresses Palestinian resistance and thereby facilitates the protection and expansion of Israeli settlements. This represents a stage at which imperialism, rather than ruling directly, operates through local elites to achieve its objectives.

[9] The billions of dollars in annual American military aid form part of a circular economic system. The funds are channelled directly to American arms manufacturers (such

as Lockheed Martin and Raytheon). British factories produce key components for F-35 aircraft. This means that continued bombardment in Gaza translates into increased profits for Western defence industries.

The claim that Israel's military sector has become integrated into the American economy is supported by recent developments:

- The $18 billion provided in the latest war represents not merely aid but investment in American defence industries.
- For the United States, Israel functions as an "unsinkable aircraft carrier," enabling control over Middle Eastern resources and energy routes.

[10] The removal of Bashar al-Assad and Israeli intervention in Syria represent a major attempt to reshape the region's geopolitical landscape. The weakening of the Syrian state enables Israel to extend its influence beyond the Golan Heights and towards Damascus. The transformation of Syria also aimed to sever supply lines between Iran and Hezbollah in Lebanon, a goal pursued through airstrikes and ground operations. Israel's consolidation of control in southern Lebanon reflects its longstanding policy of establishing a "buffer zone." The Litani River and fertile lands of southern Lebanon have long been targets of Zionist expansionism. Simultaneously, developments in the West Bank- mass displacement and the creation of fragmented enclaves- represent an intensified form of settler colonialism. The displacement of approximately one hundred thousand Muslims constitutes a continuation of the Nakba.

[11] Israel has used American aid - now only 1–2 per cent of its GDP - as seed capital to build a defence and high-technology sector valued at approximately three trillion dollars. Today, Israel exports drones, cyber weapons (such as Pegasus), and missile defence systems worldwide. A

significant portion of Israel's economy is directly or indirectly tied to military research and development, reinforcing the characterisation of Israel as a military economy.

[12] The Israeli military has played a central role in forging a unified national identity out of diverse Jewish populations - Moroccan, Russian, Polish, Ethiopian, and others. Mandatory military service serves not only defence purposes but also the creation of a shared Zionist identity and militarised ethos.

[13] Israel has developed deep defence and economic ties with Russia, China, and India, providing it with strategic alternatives in the event of pressure from Washington. During recent conflicts (2022–2025), Israel has pursued its military objectives - such as operations in Lebanon and strikes on Iran - despite occasional American reservations, indicating a growing degree of strategic autonomy.

[14] The relationship between the United States and Israel now extends beyond aid into deep corporate integration. Major American firms such as Intel, Microsoft, and Google have established large research centres in Israel. Alumni of Israel's Unit 8200 (military intelligence) play key roles in Silicon Valley. This reflects a structural integration of the American and Israeli technological and economic sectors.

[15] The analysis suggests that Israel stands at a critical historical juncture. On the one hand are its expansionist ambitions; on the other, signs of military strain and increasing international isolation. Should the United States adopt a "Vietnam model" of withdrawal, Israel's vision of "Greater Israel" may ultimately collapse.

# Shia-Sunni Unity is Indispensable for Defeating Imperialism

Javed A. Ansari

*Note:* This article was written in March 2025.

The promotion of the Sunni-Shia conflict has been an integral component of imperialist strategy from the nineteenth century to the present day. In both the Middle East and the Indo-Pak subcontinent, imperial powers - such as Britain, France, Italy, and the United States - have consistently nurtured and sustained these divisions. Today, the primary target of this campaign is to isolate the Islamic Republic of Iran from the Muslim world so that the revolutionary wave that emerged in Iran in 1978–79 may be extinguished as swiftly as possible.

The lies being propagated in the Muslim world to discredit the Islamic Republic of Iran are as follows:

1. Iran's support for the Syrian government was based purely on sectarian (Shia) considerations.
2. Iran's backing of the Islamic movement in Yemen and Hizbullah is also based on Shia sectarianism.
3. Iran is a secret ally of the United States and only fought the US Gulf War to spread Shi'ism.
4. The goal of Iranian intervention in Syria was to suppress the Sunni majority.
5. Iran instigated the Islamic government of

Yemen to fight Saudi Arabia to promote Shi'ism.

6. Iran used Hizbullah to weaken Sunni Muslims, and the US also remained an ally of Hizbullah.

Such fabrications and slanders can only be believed by those who harbour hatred for the Shia, or who are prepared to support imperialism against the Islamic Republic of Iran.

The reality is that Islamic Iran is the only Islamic country that has been resisting US imperialism in extremely adverse conditions for the past 45 years. Moreover, in the recent Jihad in Gaza, the non-Palestinians who made sacrifices were Iran and its Shia allies: Hizbullah and Ansarullah. Since the time of the Islamic Revolution, Iran has been the greatest ally of the Palestinians. To call such a country a secret ally of the US, a country that the US constantly threatens to attack (e.g., March 2025), is nothing if not slander.

شرم تم کو مگر نہیں آتی

(Sharm tum ko magar nahin aati)

Have you no shame?

It was the United States that invaded Iraq, and it was Saudi Arabia, along with its allies, that attacked the Islamic government in Yemen. Iran played no role in the Gulf War. Conversely, Iran supported the Islamic government of Yemen, which continues to offer life and wealth for the Palestinian Jihad far beyond its material capacity. Is this, too, merely an

attempt to "spread Shi‘ism"? When, in the days to come, Jordan, Lebanon, Saudi Arabia, and the United Arab Emirates stab the Palestinians in the back through their collusion with America, it will be Iran and Yemen that resist. Will we then be expected to dismiss that, too, as nothing more than an attempt to spread Shi‘ism?

The reality is that the concept of Iranian Shi'ism constructed by our imperialist masters and internalised by sections of our own society, has no basis in reality. Not a single official or unofficial document of Iranian foreign policy indicates that its goal is the spread of Shi'ism. Iran did not support Syria in order to promote Shi‘ism. The Ba‘thists were secular atheists who established an avowedly non-religious state, entirely unconnected with Shi‘ite doctrine. Those who suffered oppression did so not because they were Sunni, but because they opposed the Ba‘th regime. Many Ba‘th Party officials themselves were Sunni and remained privileged throughout its rule. However, throughout this period, the Syrian government maintained an anti-imperialist stance and, with the assistance of Russia and Iran, facilitated logistical support to Hezbollah. Russia, Iran, and Syria thus formed an anti-imperialist alliance, which bore no relation to any project of sectarian expansion.

Imam Mehdi Bazargan (Rahmatu'llah 'alaih), the

first Prime Minister of the Islamic Republic of Iran, used to say:

Neither Shia nor Sunni, the Revolution is Islamic.

This statement is not correct if it is taken to mean that an Islamic state is not bound by a specific school of jurisprudence (fiqh). Hanafi jurisprudence is in force in the Islamic Emirate of Afghanistan, and Ja'fari jurisprudence is in force in the Islamic Republic of Iran. However, it is correct in the sense that the rules of social order in different schools of jurisprudence are so close to one another that a Hanafi Muslim does not feel any difficulty in following Hanafi jurisprudence in their private life despite the state dominance of Ja'fari jurisprudence. This is why no Sunni scholar has objected to the implementation of Ja'fari jurisprudence in Iran, nor has any Shia scholar objected to the implementation of Hanafi jurisprudence in Afghanistan. This is why exemplary peace prevails in both Islamic countries (Iran and Afghanistan), and Iranian Sunnis consider themselves enthusiastic supporters of the Islamic government. In an Islamic state, sectarian prejudice automatically dissolves. Schools of Thought (madhab and maslk) become a social force, and feelings of love and brotherhood flourish among the masses.

This also explains why Iran and Afghanistan are drawing closer together. Following the visit of the

Iranian Foreign Minister to Afghanistan in March 2025, it is expected that Iran may soon formally recognise the Islamic Emirate of Afghanistan. Leaders of Hay'at Tahrir al-Sham are also reportedly seeking to establish contacts with Iran. God willing, the Islamic government of Iran will facilitate enduring cooperation between Iran, Hezbollah, and Syria which will prove to be the precursor to the defeat of imperialism and the victory of the Palestinian Jihad.

## Book Review: *Breaking the trap of Debt, Inflation, Interest and Poverty*

Quanit Khalilullah and S. Umar. Institute of Policy Studies & Policy Research Initiative for Zakat-based Interest-free Economy, 2026

***Reviewers:*** Javed Akbar Ansari & Syed Yunus Qadri

This is a well-written introductory book advocating a utopian capitalist reform [1] - the abolition of non-sovereign money [2] within capitalist economies. The book is written for the informed layman and seeks to explain the desired policy change in easily comprehensible language. The style of presentation is admirably lucid and reader-friendly.

It is divided into 5 chapters. Chapter 1 describes the currently operating fractional reserve banking system [3] and its macroeconomic impacts. Chapters 2 and 3 explicate the advocated full reserve banking model [4] and its proposed application to Pakistan. Chapter 4 discusses the compatibility of full reserve and Islamic banking procedures and suggests that rebuilding it on the 100 percent reserve model, along with the entire banking system, would make it an instrument for realising the Maqasid-e-Sharia. Chapter 5 addresses some frequently asked questions regarding 100 percent reserve banking. There are also 7 appendices – the last of which presents balance sheets of central and commercial banks before and after the hypothetical

transition to the 100 percent reserve system.

The question as to why the 100 percent reserve system has not been universally adopted despite its merits by the leading economists is addressed only in one paragraph in a text of 167 pages. This is surely the key question which should be addressed by all advocates of this stance.

As long as a country is committed to capitalism, it is necessarily committed to capital accumulation or riba – as it is the raison d'être of all economic activity [5]. The capital accumulation process valorises all market power through securitisation of trade and production operations. As capitalism matures, everything – land, labour and commodities – is converted into financial assets. Product markets shrink. Finance dominates the economy. Because capital is the concrete form of *hirs* (greed) and *hasad* (covetousness), the demand for finance – and its services – grows exponentially [6].

Finance is essentially a creation of capitalism. The financial system revolves around practices that closely resemble *riba* (interest), *gharar* (excessive uncertainty), and *maysir* (speculation or gambling). These elements are not accidental but structural features of capitalist financial markets. In a non-capitalist economy, particularly in the classical economic order of Islam, finance as a separate autonomous sector does not exist. Economic activity revolves around trade (*tijarah*),

production, and agriculture rather than the circulation of money for its own expansion. Socialism, despite its claim to oppose capitalism, is largely a variant of capitalism. While it may attempt to regulate private ownership or redistribute income, it generally retains the institutional framework (and ethos) of modern finance and therefore remains prone to financialisation[7]. Within capitalism, riba cannot be abolished because the entire system of economic growth and capital accumulation depends on it. Interest functions as the benchmark for the valuation (or valorisation) of all economic assets. The expected return on capital is measured against the prevailing interest rate, which acts as the baseline for investment decisions. This explains why the yield curve generally remains positive even when central bank policy rates fall close to zero [8], as was the case in the United States, Europe, and Japan during the period following the global financial crisis (2008–2010). Even under near-zero policy rates, financial markets still price assets according to expectations of future returns, maintaining a structure that reflects the underlying logic of interest-based finance [9]. Banks operate primarily as financial intermediaries, mobilising deposits and allocating credit. The profit paid to depositors is closely linked to interest-based benchmarks. Even when financial institutions attempt

to present returns as profit-sharing or investment income, the underlying pricing structure is typically anchored to prevailing interest rates in the market. Therefore, the financial system in capitalism is not merely a neutral mechanism for facilitating trade; rather, it is a system designed for the expansion of capital through financial instruments, where money generates more money without necessarily passing through real production.

It is also Utopian to suggest that present-day Islamic finance can be transformed by adopting the 100 percent reserve system within a national economy. First of all, there is no such thing as Islamic finance – Islamic finance is *gharar* in structure [10]. Islamic banks are merely profit-making financial intermediaries — the sole raison d'être of which is the maximisation of profit; they run on capitalist principles. They aim at capitalist property relations. They harmonise with global money and capital markets.

Current-day Islamic banks are deeply embedded in global money and capital markets. Indebtedness cannot be delinked from the global growth of debt. Nor would a 100 percent reserve model prevent governments substituting foreign borrowing for domestic borrowing.

Certainly, a fully Islamic economic and monetary system would ensure that the Islamic state has a

monopoly over controlling and directing the quantity of money and credit. It must do so in the context of abolishing capitalist property in all its forms. A first step in this direction must be the nationalisation of all existing banks and the abolition of their profit-making role. It must abolish money and capital-markets and sever links with all global money and capital markets and international financial institutions. Money and credit creation must be a social service — like defence or the preservation of law and order. De-commodifying money, as Islam envisages, is taking it out of the circuit of markets — the ever-growing valorisation of all assets. Capitalism cannot be reformed. It must be transcended.

## Notes & References

[1] The authors' proposal is frequently dismissed as utopian, yet the label requires nuance. The abolition of non-sovereign money is not mechanically impossible; rather, it is 'utopian' because it seeks to decouple the banking system from its primary profit engine—fractional reserve lending—without acknowledging the necessity of transcending the capitalist framework itself.

[2] In the context of the book we are reviewing (and in broader political economy) non-sovereign money refers to currency or credit created and issued by private institutions (commercial banks) rather than by the state or a central sovereign authority. While we often think of "money" as the physical notes and coins in our pockets (which are sovereign), the vast majority of the money supply in a modern capitalist economy is actually non-sovereign.

[3] Fractional reserve lending is a banking system where only a fraction of bank deposits are backed by actual cash on hand and are available for withdrawal. This is the standard mechanism for money creation in most modern capitalist economies.

[4] The Full Reserve Banking model (also known as 100% reserve banking) is a monetary system where banks are required to keep the entire amount of every depositor's funds in cash, or as electronic deposits at the central bank, at all times. Unlike the fractional reserve system, banks in this model cannot lend out the money you place in a demand deposit (checking/savings) account.

[5] Riba (interest) is not just a contract issue, but a systemic issue. If the money supply itself is created as interest-bearing debt, then "Sharia-compliant" products built on top of it are merely cosmetic. A 100% reserve system is presented here as the only way to ensure social justice and the protection of wealth (Mal).

[6] Ultimately, the authors' proposal hits a wall that is more metaphysical than technical. As long as a country remains committed to the capitalist framework, it is tethered to the logic of infinite capital accumulation- a process that is synonymous with Riba. Capital is not a neutral tool; it is the concrete expression of hirs and hasad, and its raison d'être is the total financialisation of land, labour, and life. By proposing a 100 per cent reserve system without a total transcendence of the capitalist order, the authors are attempting to build a 'stable' banking system for a 'pathologically unstable' ideology. The one-paragraph dismissal of why this system is not adopted is, therefore, not a mere oversight; it is a symptom of a refusal to acknowledge that capitalism and the Maqasid-e-Sharia are fundamentally irreconcilable.

[7] Even under state ownership, the socialist "firm" must still calculate efficiency and "return on investment," which inevitably relies on the same mathematical benchmarks as interest-based finance. This explains why socialist states have historically remained tethered to global financial markets.

[8] It demonstrates that the "interest rate" is not just a policy choice by a central bank; it is the internal rate of return required by capital to justify its own existence.

[9] The persistence of a positive yield curve during periods of zero-interest policy serves as empirical proof that 'Riba' is not merely a policy choice of the central bank, but a structural requirement of capital itself. Even when the state attempts to suppress the 'price' of money, the market continues to price assets based on a forward-looking expectation of accumulation. A 100 per cent reserve system might change the balance sheet of the bank, but it cannot flatten the yield curve of the capitalist soul, which remains driven by the pursuit of more money from money (M . . . M').

[10] Even "Sharia-compliant" derivatives or profit-sharing agreements (Mudarabah/Musharakah) in a capitalist context often involve a level of risk and uncertainty that mimics the gambling (Maysir) of the conventional stock market.